ستون

مرزا ادیب

ان بلند ہمت فنکاروں کے نام
جو پاکستان میں سٹیج رائج کرنے کی
جدوجہد میں مصروف ہیں

ترتیب

حرفے چند، ڈاکٹر وزیر آغا، ۱۱

رشتہ، ۲۵

اسفنج، ۶۹

حویلی، ۱۱۳

زینت، ۱۵۱

نئی ہمسائی، ۱۶۹

بارش، ۱۸۵

سوتیلی ماں، ۲۰۵

پرچھائیں، ۲۲۵

شاہینہ، ۲۴۵

قندیل، ۲۶۳

انصاف، ۲۸۱

ستون، ۳۰۳

نہ نہ نہ، ۳۲۳

لفافے، ۳۵۳

حرفے چند

کسی ڈراما کے حُسن و قبح کا صحیح اندازہ سٹیج پر اس کی پیشکش کے بعد ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ڈراما دراصل وہ واحد صنفِ ادب ہے جو محض خارجی زندگی کی عکاسی پر اکتفا کرتی ہے اور اس کام کی تکمیل کے لئے کہانی کے کرداروں کو ان کے جسمانی روپ میں پیش کرنا اور ان کے رجحانات و میلانات کی کشمکش اور آویزش کو خارجی سطح پر منعکس کرنا اپنا فرضِ اولین قرار دیتی ہے۔ پس جب ڈراما سٹیج کو اصل زندگی کے اس قدر قریب کر دے کہ ناظر کو ان دونوں کی حدِ فاصل کا احساس باقی نہ رہے تو سمجھئے کہ یہ ڈراما اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور اس نے زندگی کے

ایک خاص واقعہ اور اس واقعہ میں حصہ لینے والے کرداروں کو ایک نئی زندگی بخش دی۔ اس لحاظ سے ڈراما اور سٹیج کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور سٹیج پر ہی ڈراما کی قوت یا عجز کا ٹھیک طور سے اندازہ لگانا ممکن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب ڈراما کتابی صورت میں چھپ کر ہمارے سامنے آتا ہے تو ہم اسے ناول یا افسانہ کے طور پر پڑھتے اور اس سے وہی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں جو در اصل ناول یا افسانہ سے وابستہ کرنی چاہئیں تو ہم بالعموم اس کی صحیح پرکھ سے بہت دور ہٹ جاتے ہیں۔

چھپے ہوئے ڈرامے سے پوری طرح محظوظ ہونے اور اسے ٹھیک طور سے پرکھنے کے لئے ایک مختلف اندازِ نظر کی ضرورت ہے اور یہ اندازِ نظر ڈراما اور ناول کی حدِ فاصل کو قائم کرنے سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ناول یا افسانے کا انداز "بیانیہ" ہوتا ہے اور ناول نگار یا افسانہ نگار پلاٹ کی تشکیل، کرداروں کی پیشکش، ماحول کی عکاسی اور رجحانات کے تجزیے کے لئے بالکل آزاد ہوتا ہے۔ وہ محض واقعات کو ہی نہیں دیکھتا، واقعات کے پسِ پشت تحریکات اور رجحانات کی تہہ در تہہ کیفیات تک بھی رسائی پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی طرح وہ محض چلتے پھرتے کرداروں کے اعمال اور حرکات

تک ہی خود کو محدود نہیں رکھتا بلکہ ان کے پسِ پشت جذبات کے زیر و بم اور احساسات کے مدوجزر کا بھی جائزہ لیتا ہے اور تصویر کو اس کے سارے خارجی اور باطنی محاسن کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ماحول کی عکاسی کے سلسلے میں بھی وہ قاری کے لئے بڑے التزام کے ساتھ تصویر بناتا، رنگ بھرتا اور نقوش کو واضح کرتا ہے اور پھر اس پس منظر پر اپنے کرداروں کے تصادم کو پیش کر دیتا ہے۔ مگر اس ساری عکاسی کے دوران میں ناول نگار یا افسانہ نگار کا کام محض ایک غیر جانبدار تماشائی کا سا نہیں ہوتا بلکہ وہ جابجا خود اپنے محسوسات، جذبات اور نظریات کو بھی پیش کرتا ہے اور کتنی ہی بار کردار، واقعہ، نظریہ یا ماحول کے بارے میں اپنے شخصی تاثرات کو بیان کرنے لگتا ہے۔ گویا ناول نگار کے پاس نہ صرف ایک وسیع کینوس ہوتا ہے بلکہ وہ وقت اور جگہ کی پابندیوں سے بھی بڑی حد تک آزاد رہتا اور تصویر کی پیشکش میں اپنے مخصوص ردِ عمل کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ یہ چیز جہاں ناول نگار سے ایک پختہ ذہن، فنکارانہ گرفت اور عمیق مشاہدہ کی طالب ہے وہاں اسے اپنے موضوع سے پورا انصاف کرنے کا موقع بھی عطا کرتی ہے اور اسے ان مشکلات سے محفوظ بھی رکھتی ہے جن سے ایک ڈراما نگار کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ناول کے بیانیہ انداز کے برعکس ڈراما کا کام حرکات اور بول چال کی "نقل" پیش کرنا ہے ـــ اس طور پر کہ نقل پر اصل کا گمان ہو اور جس طرح عام زندگی تشریحات و توضیحات سے ماورا ہے اور حقائق کو ان کی کرخت اور ٹھوس صورت میں پیش کرتی ہے بعینہٖ ایک ڈراما نگار کو اپنی پیشکش میں غیر ضروری تفصیلات اور تشریح و بیان کے بیشتر پیچیدہ امور کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے اور وہ پلاٹ کی تشکیل، کردار کی پیشکش اور مافی الضمیر کے اظہار کے لئے حد درجے کے ایجاز و اختصار کو بروئے کار لاتا ہے۔ وہ بالعموم بہت سے واقعات، امور اور کرداروں میں سے چند واقعات، چند امور اور چند کرداروں کو منتخب کر لیتا ہے اور انہیں اس انداز سے روشن کر کے پیش کرتا ہے کہ ناظر کی نگاہیں ان پر جم جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ ڈراما نگار کو عام زندگی میں سے اپنا مواد اخذ کرنا ہوتا ہے اور عام زندگی جگہ کی وسعت، وقت کی فراوانی اور کردار کی ناپختگی کے باعث بالعموم ڈراما کی سرحد سے دور دور ہی رہتی ہے۔ چنانچہ ڈراما نگار کا کام یہ ہے کہ وہ جگہ کا تعین کرے، وقت کی طنابیں کھینچ دے اور واقعے اور کردار کے امتیازی عناصر کو اس انداز سے بڑھا چڑھا کر پیش کرے کہ ناظر کی نگاہیں انہیں فوراً اپنی گرفت میں لے لیں۔

ڈراما نگار کو نہ صرف ایک مخصوص جگہ، محدود وقت اور کرداروں کے منہ سے نکلے ہوئے چند جملوں کی مدد سے پلاٹ کی تعمیر کا کام سرانجام دینا ہوتا ہے بلکہ اسے اس مشکل سے بھی

سے کام لے کر ڈرامے کی اہم ترین کڑیوں کو ایک دوسری سے منسلک اور مربوط بھی کیا ہے۔ دراصل ایجاز، ڈراما کی کامیابی کے لئے ازحد ضروری ہے اور ایک کامیاب ڈرامانگار کے لئے کردار کی تشکیل، پلاٹ کی تعمیر اور مکالمے کی ترتیب میں ایک بڑی حد تک اسے ملحوظ رکھنا پڑتا ہے تاکہ غیر ضروری تفصیل اور تشریح کے عناصر سے ڈرامائی کیفیات کی شدّت انحطاط پذیر نہ ہو جائے۔ میرزا ادیب صاحب سٹیج کی ضروریات اور ڈراما کے بنیادی عناصر سے اس درجہ واقف نظر آتے ہیں اور انہوں نے اپنے طریق کار میں کفایت (ECONOMY) سے اس درجہ کام لیا ہے کہ ان کے ڈراموں میں کہیں بھی رفتار کے دھیما پن یا پلاٹ کی سست روی کا احساس نہیں ہوتا۔ کردار کی تشکیل میں بھی انہوں نے حد درجے کے ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھا ہے اور مکالمے بھی برجستہ، مختصر اور برمحل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ہر کردار کے مخصوص لہجے اور الفاظ کے مخصوص استعمال کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو ڈرامے کے مجموعی تاثر کو بڑھانے میں مدد دیتی ہیں اور ڈراما کے مختلف عناصر کو اس انداز سے پیش کرتی ہیں کہ کھیل میں ناظر کی دلچسپی برابر قائم رہتی ہے ——— یہ نہیں کہ ڈراما کے فنی لوازمات اور مقتضیات کو پیشِ نظر رکھنے کی اس دھن میں میرزا صاحب نے ڈرامے کے مرکزی خیال، رجحانات کے تصادم یا زندگی کے بارے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر پر کم توجہ دی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چند مستثنیات سے قطع نظر،

ان کے ڈراموں کے پسِ پشت، ان کی گہری سوچ کی کارفرمائی صاف دکھائی دیتی ہے اور واقعات اور کرداروں کا سہارا لے کر بڑی خوبصورتی سے منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس نکتے کے ثبوت میں میرزا ادیب صاحب کے بعض ڈراموں کا تجزیہ ضروری ہے تاکہ ڈراما نگاری کے سلسلے میں ان کی صلاحیتوں اور ڈراما کے پسِ پشت ان کی گہری سوچ کے عناصر کی صحیح پرکھ کی جا سکے۔

زیرِ نظر مجموعہ کا ایک اہم ڈراما "قندیل" ہے۔ اس میں صرف تین کردار ہیں — شالی آغا، احمد عارف اور سلیم۔ شالی آغا ایک مصوّر ہیں، احمد عارف ان کے دوست ہیں اور سلیم ان کے شاگرد۔ ڈراما میں شالی آغا کے کردار کو بڑی چابکدستی سے ابھارا گیا ہے۔ اس کردار کی حرکات و سکنات، اس کی متلوّن مزاجی اور ایک آئیڈیل کی تلاش میں اس کا استغراق و انہماک —— یہ سب باتیں شالی آغا کی سیماب وار شخصیت کے ایسے خدوخال ہیں جو انہوں خود ڈراما کے مختلف واقعات کی آویزش اور تصادم کا سہارا لے کر ابھرے ہیں۔ لیکن ناظر کے لئے شاید ڈراما کا سب سے دلچسپ پہلو اس کی وہ فضا ہے جس میں شروع سے آخر تک ایک SUSPENSE قائم رہتا ہے۔ مصوّر کے لئے یہ امید کہ وہ اگر تصویر میں اپنی محبوبہ کے خدوخال پیدا کر سکا تو وہ سچ مچ اسے گوشت پوست کی صورت میں حاصل بھی کر سکے گا، دراصل ایک ایسی امید ہے جس میں ڈراما کے ناظر بھی شامل ہیں اور اسی لئے ڈراما کے ہر مدوجزر پر ان کے دل بھی دھڑکتے چلے جاتے ہیں۔ شاید امید کی

اسی لَو اور توقعات کی اسی تعمیر کا یہ نتیجہ ہے کہ جب آخر میں یہ رنگ محل ایک بلبلے کی طرح پھوٹتا ہے اور مصوّر کی ساری توقعات اور اس کی حیات کی آخری رمق کو بھی بجھا دیتا ہے تو ناظر کی اپنی توقعات بھی دفعتاً بجھ جاتی ہیں اور اسے بھی ایک جذباتی دھچکا پہنچتا ہے۔ ناظر کے جذبات کو اس انداز سے ایک شخصی سطح پر متاثر کرنا، ڈراما کی ایک قابلِ قدر خوبی ہے اور "قندیل" اس لحاظ سے ایک بہت کامیاب ڈراما ہے۔

لیکن "قندیل" کی ایک یہ خوبی بھی ہے کہ اس میں خارجی واقعات کے تصادم کے پسِ پشت ایک داخلی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ یہ کشمکش فنکار کے آئیڈیل اور اس کی سعی کے مابین وہ ازلی و ابدی کشمکش ہے جس کی عام زندگی میں مثال کسی دریا کے وہ دو کنارے ہیں جو ایک دوسرے کے بالمقابل رہتے ہیں لیکن جنہیں کبھی وصال نصیب نہیں ہوتا۔ ڈراما نگار نے زندگی کے بعض کرداروں کا سہارا لے کر اس حقیقت پر سے نقاب اٹھایا ہے۔ سوچ کے اس عنصر نے ڈراما کی قیمت میں یقیناً اضافہ کیا ہے۔

کسی واقعہ کو ڈرامائی روپ دینے کے لئے ایک اچھا ڈراما نگار بالعموم ناظر کی توقعات کو ابھارتا اور پھر فسخ کرتا ہے اور اپنے اس عمل سے ناظر کے

دل میں ایک ایسا جذباتی ہیجان پیدا کرتا ہے جس سے ناظر کو فنی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ "قندیل" میں میرزا ادیب نے یہی طریق اختیار کیا ہے اور فی الواقعہ اس المیے کے پیشِ نظر انہیں یہی طریق اختیار کرنا چاہئے تھا لیکن بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی کڑیاں ایک منطقی تسلسل کے تابع ہوتی ہیں اور ڈرامانگار جب انہیں ڈرامائی روپ دیتا ہے تو اپنی پیشکش سے ناظر کی توقعات کو ابھارتا اور پھر انہیں پورا بھی کرتا ہے۔ بالعموم جہاں زندگی یا زندگی کی بے اعتدالیوں اور ناہمواریوں پر طنز مقصود ہو وہاں یہی طریق احسن ہے۔ میرزا ادیب کا ڈراما "نہ نہ نہ" اس ضمن میں قابلِ ذکر ہے۔ اس ڈراما میں باپ اپنے پاگل بیٹے کو پاگل خانے میں داخل کرانے آتا ہے اور وہاں یکے بعد دیگرے چپڑاسی، جونیئر کلرک، سینئر کلرک، سپرنٹنڈنٹ، چھوٹے ڈاکٹر اور پھر بڑے ڈاکٹر کی حرص کا شکار بنتا ہے۔ لیکن ڈراما میں ایسا منطقی تسلسل ہے کہ ایک آدھ واقعے کے بعد ناظر ازخود آنے والے واقعات سے ایک خاص قسم کے نتیجے کا متوقع ہونے لگتا ہے اور جب دفعتاً وہ نتیجہ حسبِ توقع اس کے سامنے آتا ہے تو اسے ایک نامعلوم سی تسکین کا احساس ہوتا ہے۔

اسی طرح ڈراما کے آخری حصے میں جب اپنا سارا سرمایہ کھو دینے پر باپ بھی

پاگل ہو جاتا ہے اور بیٹے کی طرح ہر بات پر "نہ نہ نہ" کہنے لگتا ہے تو نہ صرف ایک ایسی ڈرامائی کیفیت معرضِ وجود میں آجاتی ہے جو اس منطقی تسلسل کا ایک لازمی نتیجہ ہے بلکہ اس سے وہ طنز بھی شدید تر ہو جاتی ہے جو ڈراما نگار کا منتہائے مقصود تھی۔

اور اب ایک ایسے ڈراما کا ذکر جو میری رائے میں اس مجموعہ کا بہترین ڈراما ہے ——میرا اشارہ "حویلی" کی طرف ہے۔

"حویلی" میں میرزا ادیب اپنے عروج پر دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے آپ کو میرے اس خیال سے اتفاق نہ ہو اور آپ اس مجموعہ کے بعض دوسرے ڈراموں بالخصوص "قندیل" کو بہتر تخلیق قرار دیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ اس لحاظ سے حق بجانب بھی ہوں گے کہ قندیل میں فنکار کی کوشش اور اس کے آئیڈیل کے درمیانی فاصلے کو شاید پہلی بار ایک ڈرامائی انداز سے پیش کیا گیا ہے تاہم بعض دوسرے اوصاف کے پیشِ نظر میں "حویلی" کے حق میں اپنی رائے دوں گا —— حویلی میں میرزا صاحب نے ڈراما کے بہت سے مقتضیات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس میں شہزادہ صاحب اور جہانگیر —— دو ایسے کردار ہیں جو اپنے اپنے نقطہ ہائے نظر کے اس درجہ حامی اور اپنے مخصوص میلانات کی نہج پر اس سنجیدگی سے گامزن ہیں کہ

قدم قدم پر لچک، کی عدم موجودگی صورتِ واقعہ (SITUATION) کو جنم دے دیتی ہے اور ناظر شروع سے آخر تک دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ واقعات کے مدوجزر میں مستغرق رہتا ہے۔ ڈراما کی یہ گرفت اس کا پہلا وصف ہے۔ حویلی کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس میں بیک وقت ایک خارجی اور داخلی کشمکش نظر آتی ہے۔ خارجی لحاظ سے دیکھئے تو باپ اور بیٹے میں گھر کے ایک اہم مسئلہ پر اختلافِ رائے پیدا ہو جاتا ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک ایسی خلیج معرضِ وجود میں آجاتی ہے جو بتدریج کشادہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ داخلی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ کشمکش محض باپ اور بیٹے کی کشمکش نہیں، یہ ماضی اور مستقبل کی وہ ازلی وابدی کشمکش ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ شہزادہ صاحب ہمارے معاشرے کا ماضی ہیں —— وہ ماضی جس کی جڑیں کمزور ہو چکی ہیں —— جہانگیر ہمارے معاشرے کا مستقبل ہے اور ماضی کے بندھنوں، اس کی روایات اور ضوابط سے بغاوت کرتا ہے۔ لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ میرزا ادیب صاحب نے اپنے اس ڈراما میں ماضی یا مستقبل کی کسی ایک حقیقت کے حق میں اپنی رائے نہیں دی بلکہ ان دونوں حقیقتوں کے تصادم کو پیش کر کے ایک طرف کو ہٹ گئے ہیں اور نتائج کا انتخاب ناظر پر چھوڑ دیا ہے۔ "حویلی" کی تیسری بڑی خوبی ہے کہ اس میں ڈرامانگار نے ناظر کے

احساسات میں تموّج اور اس کے جذبات میں ہیجان پیدا کیا ہے اور اسے زندگی کے دو بڑے رجحانات کے تصادم کا شدت سے احساس دلایا ہے لیکن اس مسئلہ پر اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے۔ کہانی کی یہ ناتمام کیفیت حقیقت کے عین مطابق ہے کیونکہ زندگی بذاتِ خود ایک بہتی ندی کی طرح ہے اور اس کا ہر واقعہ "انجام" کے بندھنوں سے بڑی حد تک آزاد ہے۔

آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ تقسیم کے بعد کے اُردو ادب میں ایکانکی ڈراما کو جو فروغ ملا ہے اس میں میرزا ادیب صاحب کی سعی کو سب سے زیادہ دخل حاصل ہے انہوں نے نہ صرف "ادبِ لطیف" کے ذریعے ڈرامے کو مقبول بنانے کے لئے ایک باقاعدہ "مہم" شروع کر رکھی ہے بلکہ خود بھی اعلیٰ درجے کے ڈرامے لکھ کر اُردو ڈراما کی عمارت مضبوط کرنے کی سعیٔ جمیل میں مصروف ہیں۔ ان کے ڈراموں کا زیرِ نظر مجموعہ "ستون" ان کی اسی عمارت کا ایک بڑا ستون ہے اور مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ انہوں نے یہ مجموعہ پیش کر کے اُردو ادب کی توانائی میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

○

Ashraf

رشتہ

افرادِ تمثیل

ظفر
محمودہ
فہمیدہ
فاطمہ
اشفاق
ثریا جبیں
احسان علی
ساجدہ
رحمت

پہلا منظر

ظفر کا کمرہ

فرنیچر دو کرسیوں، ایک صوفہ سٹ، ایک چھوٹی گول میز اور ایک بک شیلف پر مشتمل ہے۔ سامنے کی دیوار کی مینٹل پیس پر کچھ کتابیں پڑی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ٹائم پیس بھی ہے جو سوا چار کا اعلان کر رہا ہے۔ مغربی دیوار کے قریب ہینگر پر ظفر کے کپڑے لٹک رہے ہیں۔ ان میں غالباً دو قمیصیں ہیں اور ایک پاجامہ —— دروازہ ایک ہے جو مشرقی دیوار میں ہے اور جس کا ایک پٹ کھلا ہے —— جب پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج پر کوئی شخص دکھائی نہیں دیتا۔ تین چار لمحوں کے بعد ظفر آتا ہے۔ ظفر درمیانے قدو قامت کا نوجوان ہے۔ رنگ سانولا، نقش تیکھے۔ عمر چوبیس کے لگ بھگ۔ اس وقت سیاہ اچکن اور پاجامے میں ملبوس دکھائی دے رہا ہے —— کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ سیدھا ہینگر کی طرف جاتا ہے۔ اچکن اتار کر ہینگر پر لٹکا دیتا ہے۔ پھر ہینگر کے نیچے ادھر اُدھر دیکھنے لگتا ہے جیسے کوئی

چیز تلاش کر رہا ہو۔ جلدی سے دروازے پر جاتا ہے اور بلند آواز میں کہتا ہے "موواں میرے سلیپر کہاں ہیں؟" یہ کہہ کر دروازے سے ہٹ کر اُس کرسی پر بیٹھ جاتا ہے جس کا رُخ مشرقی دیوار کی طرف ہے۔

محمودہ آتی ہے — ایک دُبلی پتلی لڑکی۔ خوبصورت نہیں مگر بدصورت بھی نہیں کہی جا سکتی۔ چہرے کی سب سے نمایاں خصوصیت وہ سنجیدگی ہے جو مسکراتے وقت بھی دُور نہیں ہوتی۔ بات دھیمے انداز میں رُک رُک کر کرتی ہے

لباس — شلوار، قمیص، سویٹر اور دوپٹہ۔

اس کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی ہے۔ دوسرے میں ظفر کے سلیپر جو خوب چمک رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی پالش کیے گئے ہیں۔ دائیں بازو پر کچھ اُجلے کپڑے لٹک رہے ہیں۔ محمودہ چائے کی پیالی ظفر کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ سلیپر آہستہ سے فرش پر رکھ دیتی ہے۔ میز اُٹھا کر اس کے سامنے لے آتی ہے۔ اس کا میز پوش اٹھا لیتی ہے اور اس کی بجائے کندھے سے اُجلا میز پوش لے کر میز پر بچھا دیتی ہے۔ میلا میز پوش دوسرے کندھے پر رکھ لیتی ہے۔ ظفر اس دوران اسے محبت آمیز نظروں سے دیکھتا رہتا ہے — محمودہ بڑی سنجیدگی سے یہ کام انجام دیتی رہتی ہے۔

محمودہ : چائے پی کر اُدھر جائیں — خالہ جان بُلا رہی ہیں آپ کو

ظفر : کیا بات ہے؟

محمودہ: معلوم ہو جائے گی۔ (ذرا مسکرا کر) اس قدر بیتاب کیوں ہیں؟
ظفر: بتائیں کیوں نہیں۔ معلوم تو ہو ہی جائے گی۔ تم بتا دو تو کیا حرج ہے؟
محمودہ: اچھا چائے تو پیجیے۔

(محمودہ، ہینگر کی طرف جاتی ہے۔ دُھلی ہوئی قمیص اور پاجامہ وہاں لٹکا دیتی ہے اور میلے کپڑے ہٹا کر اپنے اس شانے پر لٹکا لیتی ہے جس پر میلا میز پوش پڑا ہے۔ ظفر کی طرف آتی ہے۔ ظفر نے ابھی تک پیالی ہونٹوں سے نہیں لگائی وہ محمودہ کی طرف دیکھ رہا ہے)

ظفر: بس اور تو کوئی کام نہیں اس خاکسار کے کمرے میں۔
محمودہ: (ذرا مسکرا کر) آپ پیالی خالی کر دیں تو وہ بھی اُٹھا لوں۔
ظفر: بہتر۔
محمودہ: آپ پی ہی نہیں رہے خالی کیونکر ہو گی؟
ظفر: (پیالی میز پر رکھتے ہوئے) مُوداں!
محمودہ: کہیئے!
ظفر: وہ معاملہ اب کہاں تک پُہنچ گیا ہے۔
محمودہ: وہی بے تابی — توبہ (چائے کی پیالی کی طرف دیکھتی ہے) کیا آج چائے کی بجائے شربت پینے کا ارادہ ہے۔
ظفر: کچھ بتاؤ تو — (پیالی اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیتا ہے، ایک گھونٹ پیتا

ہے) میں کیا پوچھ رہا ہوں ہوداں!

محمودہ: میں کیا بتاؤں؟

ظفر: پھر بھی!

محمودہ: پھر بھی — پھر بھی کیا؟ — اب بوٹ اتار دیجئے نا۔ سلیپر جو لے آئی ہوں۔

ظفر: میں کیا پوچھ رہا ہوں تم سے؟

محمودہ: خالہ جان آپ کو بُلا رہی ہیں۔ یہ بتانے کے لیے کہ آج ان کی طرف سے نیا خط آیا ہے (مسکرانے کی کوشش کرتی ہے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسکراہٹ مصنوعی ہے) اُنھوں نے آپ کو بُلایا ہے۔ صُبح کی گاڑی سے آپ منٹگمری جا رہے ہیں — اور پھر — ایک دن — ایک چاند سی دلہن اس گھر میں آ جائے گی — قصّہ ختم — مہربانی کر کے یوں ٹکٹکی باندھ کر میری طرف نہ دیکھیے۔ چائے پیجئے۔ مجھے ادھر بہت سے کام ہیں۔ بیکار نہیں آپ کی طرح۔

ظفر: مجھے بُلایا ہے اُنھوں نے؟

محمودہ: وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ مہمان بن کر حضور جا رہے ہیں سمجھ لیا ناں! خُوب خُوب خاطر مدارات ہونگی آپ کی — اور کیا چاہیے!

ظفر: (مُسکرا کر) اچھا ایک چاند سی دلہن یہاں آ جائے گی تو تم کیا کرو گی؟

محمودہ: میری فکر کیوں پڑ گئی آپ کو — ماموں کے ہاں چلی جاؤں گی —
بلکہ جا رہی ہوں — بہت جلد۔

ظفر: تم چلی جاؤ گی تو پھر اتنی محبت سے میرے کمرے کی صفائی کون کرے گا؟
— میری ایک ایک ضرورت کا خیال کون رکھے گا — مجھے اتنا آرام
کون پہنچائے گا — اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ مجھ سے اتنی محبت کون
کرے گا؟

محمودہ: وہ جو آئے گی —

ظفر: وہ چاند سی دُلہن — اس کا تعلق تو چاند سے ہو گا — خاکسار
تو دھرتی پر رہتا ہے۔

محمودہ: سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اطمینان رکھیے۔

(محمودہ ہنس پڑتی ہے مگر جلدی سے قہقہہ ضبط کر جاتی ہے)

ظفر: اوںہوں — ایسا کبھی نہیں ہو گا (جلدی جلدی چائے پیتے ہوئے) ایسا
کبھی نہیں ہو گا۔ تمھیں یہاں رہو گی۔

محمودہ: آپ اسے ابھی تک مذاق سمجھ رہے ہیں شاید!

ظفر: مذاق تو نہیں سمجھتا مگر یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ اس گھر میں تمھیں رہو گی۔

محمودہ: سب کچھ جانتے ہوئے بھی آپ ایسی باتیں کر رہے ہیں۔

ظفر: میں سب کچھ جانتا ہوں موداں! اسی لیے ایسی باتیں کر رہا ہوں!

محمودہ : خالہ جان اور آپی نے آپ کی شادی کا معاملہ بالکل طے کر لیا ہے
— دونوں کو منٹگمری والا رشتہ بے حد پسند ہے اور آپ کل ان کے
ہاں جا بھی رہے ہیں، پھر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ حیرت ہے۔

ظفر : شادی تو میری ہوگی نا؟

(خالی پیالی میز پر رکھ دیتا ہے)

محمودہ : اور کس کی ہوگی بھلا؟

ظفر : یہ معاملہ میرا ہے اور (مسکرا کر) میں خوب جانتا ہوں کہ میری رفیقۂ
حیات کون ہوگی! تم نہیں جانتیں کیا؟ — خاموش کیوں ہو؟

(محمودہ خاموش آنکھیں جھکائے کھڑی رہتی ہے)

محمودہ : کیا کہہ سکتی ہوں۔ آپ اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے اس معاملے
سے بالکل بے خبر ہیں۔

ظفر : بے خبر نہیں ہوں۔

محمودہ : خوش فہمی میں مبتلا ہیں تو الگ بات ہے — ورنہ معاملہ تو بالکل
صاف ہے۔

ظفر : موداں! میں خوب جانتا ہوں۔ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا کرنا ہوگا۔

محمودہ : ضد کریں گے آپ؟

ظفر : اگر ضد نہیں کروں گا تو امی اور باجی اس ضد سے باز کیوں کر آئیں گی۔

محمودہ : (پلکیں اٹھا کر ظفر کی طرف دیکھتے ہوئے) دیکھیے تو۔

ظفر : کیا؟

محمودہ : آپ ضد نہ کیجیے!

ظفر : تمھیں اس سے کیا واسطہ؟

محمودہ : واسطہ ہے فلاں جبھی تو کہہ رہی ہوں۔

ظفر : میں نہیں سمجھتا!

محمودہ : آپ سمجھتے کیوں نہیں — میں اپنی محسن خالہ جان اور ان کی خواہش کے درمیان دیوار ہرگز نہیں بنوں گی۔

ظفر : تم نہیں چاہتیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر زندگی بسر کریں! نہیں چاہتیں تم!

(محمودہ خاموش رہتی ہے)

میں کیا پوچھ رہا ہوں تم سے — بولو نا — جواب دو موداں!

محمودہ : انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ خالہ اور آپی مجھے بہت عزیز سمجھتی ہیں مگر . . .

ظفر : (جلدی سے) اور انھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم ایک دوسرے کی ذات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں۔

محمودہ : (رک رک کر) جانتی — ہیں پھر بھی وہ مناسب یہی سمجھتی ہیں کہ ثریا جہاں

اس گھر میں دلہن بن کر آئے۔ آپ کو چاہیے کہ ان کی خواہش پوری کریں۔ خالہ جان آپ کی ماں بھی ہیں اور باپ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں — خالو کے انتقال کے بعد یہ حیثیت بھی انھیں حاصل ہے اور پھر ماں — کی قدرتاً خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے بیٹے کی شادی کسی اونچے اور معزز گھرانے میں ہو نئے رشتہ دار بنیں اور ان کی وجہ سے خاندان کی عزت میں اضافہ ہو —

ظفر: اور میری بھی یہ فطری آرزو ہے کہ میری زندگی سکون اور راحت میں بسر ہو۔ میری یہ آرزو جائز نہیں کیا؟

(محمودہ خاموش رہتی ہے)

بھئی مودان! تم کیوں نہ کہ کرتی ہو — امی اور باجی مجھ سے پوچھے بغیر جو چاہتی ہیں کر جاتی ہیں۔۔ عجیب معاملہ ہے۔

محمودہ: خالہ اور آپی بھی کہیں گی ہاں کہ میں نے رخنہ ڈالا ہے۔

ظفر: و، ، کیسے؟

محمودہ: میں کہہ چکی ہوں کہ خواہ حالت کچھ ہو میں ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ میں جانتی ہوں اس وقت آپ پریشان ہیں اس رشتے پر، مگر یہ پریشانی عارضی ہے۔ آپی کہتی ہیں کہ ان کی ہونے والی بھابی لاکھوں میں ایک ہے — اس کے والدین نہایت نیک اور فرشتہ سیرت ہیں۔

خوش خلق اور ملنسار اور۔
ظفر: جی ہاں واقعی بڑے نیک اور فرشتہ سیرت ہیں۔ ایک درجن کے قریب تو خط آئے ہوں گے ان کی طرف سے اور ہر خط میں اطلاع دی جاتی ہے کہ ہماری لڑکی یہ چیز پسند کرتی ہے یہ نہیں کرتی۔ اس کا ماہانہ خرچ اتنا ہوگا۔ لڑکے کی تنخواہ بہت کم ہے۔ شادی کے بعد الگ مکان کا بندوبست کرنا ہوگا۔ مجھے تو لالچی معلوم ہوتے ہیں۔ اول درجے کے لالچی۔ عجیب بات ہے۔ آج کل لڑکی والے اپنی لڑکی کی شادی بنگلے، بیوک اور بنک بیلنس سے کرتے ہیں، لڑکے سے نہیں کرتے۔ یہی بات یہاں بھی ہے۔
محمودہ: ان کی باتیں سنے بغیر آپ کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ آپ نے آج تک ان کی اور انھوں نے آپ کی صورت تک نہیں دیکھی۔
ظفر: یہ تو صحیح ہے تاہم میرا اندازہ غلط نہیں ہے۔
محمودہ: جب آپ ان سے ملیں گے تو یقیناً آپ کی وہ رائے نہیں ہوگی جو اس وقت ہے۔ بہر حال میں کہہ چکی ہوں کہ خالہ اور آپی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنوں گی۔ خالہ جان کا یہ احسان کم نہیں ہے کہ جب میں ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی تھی انھوں نے مجھے سہارا دیا، مجھے اپنے گھر لے آئیں، میری پرورش کی، مجھے پڑھایا لکھایا۔ اب میری وجہ سے کوئی تلخی پیدا ہوئی تو

مجھے اس کا بہت دُکھ ہوگا۔

ظفر: یہ سب کچھ دُرست ۔۔۔ مگر معاملہ تو میرا ہے ناں ۔۔۔ جو کچھ کروں گا میں کروں گا ۔۔۔ تمھیں اس سے کیا؟

محمودہ: ہنگامہ تو میری وجہ سے ہوگا آخر

ظفر: میں کہہ سکتا ہوں ۔ میرے معاملے تم کیوں دخل دیتی ہو؟

محمودہ: اور ۔۔۔ (مُنہ مچکاتی ہے)

ظفر: اور کیا؟ ۔۔۔ مودان!

محمودہ: میری شادی کا معاملہ بھی میرا ذاتی معاملہ ہے۔

ظفر: ہے تو ۔۔ (غور سے محمودہ کی طرف دیکھتا ہے ۔۔۔۔۔ پھر!

محمودہ: میں انکار بھی کر سکتی ہوں

ظفر: مودان! ۔ یہ تم کیا کر رہی ہو؟

محمودہ: مجھے اس کا افسوس ہے ۔۔۔ بہتر یہ ہے کہ آپ ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح ماں کی بات مان لیں۔

ظفر: یہ توقع نہیں تھی مجھے تم سے!

محمودہ: مجبوری ۔۔

(ظفر گھور کر محمودہ کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ محمودہ آنکھیں جھکائے کھڑی ہے)

ظفر: اگر ان لوگوں نے خود ہی انکار کر دیا تو

محمودہ : خالہ جان اور آپی کی خواہش ہر حال میں مقدم ہے۔

(محمودہ بھیگی پلکیں اٹھا کر ظفر کو دیکھتی ہے اور کمرے سے نکل جاتی ہے۔ ظفر سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں غرق ہو جاتا ہے —— فہمیدہ آتی ہے۔ چھریرے جسم کی لڑکی۔ نقش بجائی کی مانند تیکھے۔ لباس محمودہ جیسا اس فرق کے ساتھ کہ اُس نے دوپٹے کی بجائے گرم چادر اوڑھ رکھی ہے —— ظفر سے ایک دو سال بڑی ہے)

فہمیدہ : ظفر! محمودہ نے تم سے کہا نہیں کہ امّی بلا رہی ہیں تمھیں!

ظفر : (ابھی تک سوچ میں ڈوبا ہوا ہے) کیا؟

فہمیدہ : سوچ کیا رہے ہو —— میں پوچھتی ہوں محمودہ نے تم سے کہا نہیں کہ امّی بلا رہی ہیں تمھیں!

ظفر : کہا ہے۔

فہمیدہ : پھر گئے کیوں نہیں؟

ظفر : کیا بات ہے —— امی کیا کہنا چاہتی ہیں۔

فہمیدہ : منٹگمری سے خط آیا ہے۔ بلایا ہے اُنھوں نے۔ چھٹی کی درخواست دے دو اور صبح کی گاڑی سے چلے جاؤ!

ظفر : صبح چلا جاؤں؟

فہمیدہ : کیوں حرج کیا ہے۔ وہ منتظر ہوں گے!

ظفر: یہ تو مشکل ہے باجی!

فہمیدہ: کیوں؟

ظفر: کراچی سے انٹرویو کے لیے بلاوا آیا ہے۔ بہت اچھی نوکری ہے مل جائے تو لطف آجائے۔

فہمیدہ: انٹرویو کے لیے بلاوا کب آیا ہے؟

ظفر: میری درخواست محکمے کی طرف سے بھیجی گئی تھی۔ صرف چند روز کی بات ہے۔ چلا جاؤں گا ادھر بھی۔

فہمیدہ: تو صبح نہیں جاؤ گے؟

ظفر: کہ تو رہا ہوں باجی! کل تو مجھے کراچی روانہ ہو جانا چاہیے — وہاں دو چار روز بعد چلا جاؤں گا۔ کیا حرج ہے!

فہمیدہ: حرج تو کوئی نہیں — وہ لوگ منتظر رہیں گے۔

ظفر: وہاں خط لکھ دو۔

فہمیدہ: چل کر امی سے بھی بات کر لو۔ اگر مجبوری ہے تو خط لکھ دوں گی!

(فہمیدہ دروازے کی طرف جاتی ہے۔ ظفر بھی قدم اٹھانے لگتا ہے — پردہ گرتا ہے)

٭

دُوسرا منظر : ایک کمرہ

اس کمرے کو سجانے میں خاص احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یا تو اسے کسی مہمانِ خاص کے لیے سجایا گیا ہے یا یہاں کوئی تقریب ہونے والی ہے۔

فرش پر قالین، اعلیٰ ڈیزائن کا صوفہ سیٹ، تین کرسیاں، ریڈیو سٹ اور ایک میز۔ کارنس پر رنگا رنگ پھولوں سے مزین گلدان۔ دیواروں پر خوبصورت تصویریں، دونوں دروازوں پر رنگین پردے۔ جن کے رنگ بڑے گہرے ہیں یہ کمرہ اندازِ تزئین کے اعتبار سے یہاں رہنے والوں کے ذوقِ سلیم کا اظہار نہیں کرتا کیونکہ یہاں نفاست کم اور رنگا رنگی زیادہ ہے۔ ایک دروازہ مشرقی دیوار میں کھلتا ہے جس کی دوسری طرف خواب گاہ ہے۔ مغربی دیوار والا دروازہ کسی اور کمرے میں کھلتا ہے۔ آنے جانے والے اس کمرے سے آتے جاتے ہیں۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو کمرے میں کافی روشنی پھیلی ہوئی ہے: دن کے نو دس کا عالم ہوگا۔

ثریا جبیں سامنے کی دیوار کے پاس، ایک کُرسی پر کھڑی دیوار پر تصویر لگانے میں مصروف ہے۔ اس کا رُخ اس وقت دیوار کی جانب ہے۔

ہم اس کی شکل نہیں دیکھ سکتے تاہم کچھ چیزیں تو نظر آ رہی ہیں --- سب سے پہلی چیز اس کے لباس کا بھڑکیلا پن ہے ۔ وہ لمبی قمیص۔ شلوار اور سویٹر میں ملبوس ہے۔ دوپٹہ ٹھوڑی کے نیچے سے گزرتا ہوا دونوں شانوں پر سے ہوتا ہوا پشت پر لٹکا ہوا ہے --- کانوں میں آویزے چمک رہے ہیں۔

ثریا جبیں کی کرسی کے نزدیک رحمت کھڑی ہے -- لمبی تڑنگی خادمہ اس کے دائیں ہاتھ میں ہتھوڑی نظر آ رہی ہے۔

ثریا جبیں : (تصویر دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے) دیکھو رحمت! سیدھی ہے نا۔

(رحمت اپنی جگہ سے ہٹ کر کرسی کے پیچھے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو جاتی ہے تصویر کی طرف غور سے دیکھتی ہے)

رحمت : ٹھیک ہے۔

ثریا جبیں : (بائیں ہاتھ سے تصویر تھامے بایاں ہاتھ رحمت کی طرف بڑھاتی ہے) جلدی دو۔

(رحمت اس کے ہاتھ میں ہتھوڑی رکھ دیتی ہے)

یہ کیا؟ میں کیل مانگ رہی ہوں۔ ہتھوڑی کو کیا کروں گی۔ کیل کہاں ہے؟ (ہتھوڑی واپس اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے) میں پوچھتی ہوں کیل کہاں ہے؟

رحمت : وہ تو گر پڑا بی بی!

(ثریا دیوار سے تصویر ہٹا کر رحمت کی طرف دیکھتی ہے۔ ثریا معمولی شکل وصورت کی لڑکی ہے۔ سن بائیس یا تئیس کے قریب)

ثریا جبیں: گر پڑا ہے! کیل قالین پہ گرا دیا ہے، غضب خدا کا کیل اتنے قیمتی قالین پر گرا دیا ہے۔

رحمت: اور لے آؤں؟

ثریا جبیں: اب اور لینے جائے گی۔ تصویر کیا خاک لگاؤں! ناک میں دم کر دیا ہے اس بڑھیا نے۔

رحمت: مہمان تو آیا ہی نہیں۔

(ثریا جبیں گھور کر اس کی طرف دیکھتی ہے، رحمت بے اختیار ہنس پڑتی ہے ثریا مسکرانے لگتی ہے۔ نیچے اُترتی ہے۔ تصویر کارنس پہ رکھ دیتی ہے۔ ساجدہ آتی ہے۔ ساجدہ پست قد کی بھاری بھر کم عورت ہے آنکھوں پہ عینک، اس عمر میں بھی بھڑکیلے لباس کی شائق۔ سن پنتالیس سے کم نہیں ہوگا۔ قمیص، شلوار اور سوئٹر میں ملبوس۔ گردن کے اردگرد سُرخ رنگ کا مفلر)

ساجدہ: ارے تم لوگ کیا کر رہے ہو۔ ابھی تک کمرہ ہی سجایا جا رہا ہے مہمان کل نہیں آیا تو آج کیونکر آجائے گا۔ اب چھوڑو یہ جھگڑا او گڑا۔

ثریا جبیں: تصویر لگا رہی تھی۔ امی جان!

ساجدہ : کہاں لگائی ہے؟

ثریا جبیں : لگائی کہاں ہے۔ زحمت نے کیل گرا دیا ہے۔

(غصے سے رحمت کی طرف دیکھتی ہے)

ساجدہ : ہے ہی زحمت۔

(رحمت جھک کر کیل ڈھونڈ رہی ہے۔ مل جاتا ہے)

رحمت : مل تو گیا ہے۔

(ثریا جبیں کرسی کی طرف بڑھتی ہے)

ساجدہ : اب رہنے دو تصویر تصوور (لفافہ ثریا جبیں کی طرف بڑھاتے ہوئے)

دیکھو خط آیا ہے فہمیدہ کا معلوم ہوتا ہے تمھارے نام ہے۔

ثریا جبیں : (لفافہ لے کر) اسی کا ہے اماں!

ساجدہ : پڑھو تو — بھائی کے متعلق لکھا ہوگا۔

(ثریا جبیں آنکھیں مٹکا کر لفافہ چاک کرتی ہے)

کیا ہے (بیتابی سے) آ رہا ہے کیا۔

ثریا جبیں : لکھا ہے (شرما جاتی ہے) آپ ہی پڑھ لیں۔

(رحمت ناک پر انگلی رکھے یہ منظر بڑی دل چسپی سے دیکھ رہی ہے)

ساجدہ : سنا دو بیٹی حرج کیا ہے؟

ثریا جبیں : لکھا ہے — اُمید ہے تم بہت بہت خوش ہوگی — تمھارے لیے

نئے سوئٹر کا نمونہ ۔ ہاں یہ ہے اماں جان ۔ لکھا ہے

ساجدہ : سناؤ بھی نا

ثریا جبیں : (پڑھتے ہوئے) مجھے اور امّی کو بڑا افسوس ہے کہ عین وقت پر جب بھیا آنے کی تیاری کر رہے تھے ۔ اُنھیں کراچی سے انٹرویو کا خط آگیا ہے ۔ فوراً وہاں جا رہے ہیں ۔ وہاں سے فراغت پاتے ہی تمھارے ہاں آئیں گے ۔“

ساجدہ : خواہ مخواہ کمرہ سجاتے رہے خیر آج نہ سہی چار پانچ روز بعد سہی ۔

(ثریا جبیں خاموشی سے باقی خط پڑھنے لگتی ہے ۔ احسان علی آتے ہیں ۔ لمبے قد کا آدمی ۔ لباس عام پنجابیوں کا ۔ گرم چادر لپیٹے ہوئے ۔ سر پر جناح کیپ)

احسان علی : کس کا خط ہے چھیا بیٹی !

ساجدہ : فہمیدہ کا ۔ اس کا بھائی نہیں آرہا ۔ کراچی گیا ہے انٹرویو دینے ۔

احسان علی : ممکن ہے اچھی ملازمت ہو ۔ پہلی ملازمت تو کچھ بھی نہیں تھی ۔

ساجدہ : ملازمت ملی کہاں ہے انٹرویو کے لیے جا رہا ہے ۔

احسان علی : تو اب یہاں نہیں آرہا ؟

ساجدہ : نہیں ۔

احسان علی : چلو ٹھیک ہے۔

ساجدہ : (رحمت سے) رحمت تو یہاں کھڑی کیا کر رہی ہے۔ جاؤ ادھر نل
کے نیچے برتنوں کا ڈھیر پڑا ہے۔

(رحمت، چلی جاتی ہے)

چھیا بیٹی! اور تو کچھ نہیں لکھا۔

ثریا جبیں : (دروازے کی طرف جاتے ہوئے) نہیں

(رحمت آتی ہے)

رحمت : میاں جی! ایک صاب آئے ہیں۔

احسان علی : کون؟

رحمت : کہتے ہیں میں اشفاق ہوں ــــ ظفر صاب سے ملنا ہے۔

ساجدہ اور احسان : (بیک وقت) کیا؟

(ثریا جبیں جاتے جاتے رُک جاتی ہے)

رحمت : کہتے ہیں ــ یہی کہتے ہیں، میاں جی!

احسان علی : ظفر صاحب، یہاں کہاں؟

ساجدہ : جا کر دیکھو تو

(احسان علی کمرے سے نکل جاتے ہیں)

کون ہو سکتا ہے۔

رحمت : بڑا جنٹلمین معلوم ہوتا ہے آپا !

ساجدہ : پر ان کا یہاں کیا کام ؟

(اسٹیج پر دو تین لمحے خاموشی رہتی ہے۔ احسان علی آتے ہیں)

احسان علی : بھئی تم لوگ ذرا یہ کمرہ خالی کر دو۔

ساجدہ : کمرہ بھی خالی کر دیا جائے گا۔ ہے کون ؟

احسان علی : ظفر کا کوئی دوست ہے ۔ اشفاق

ساجدہ : یہاں کیا کرنے آیا ہے ؟

احسان علی : ظفر کو دیکھنے

ساجدہ : ظفر یہاں کب آیا ہے ۔۔ کہ وہ یہاں نہیں آیا۔ کراچی گیا ہے کہا نہیں ؟

احسان علی : یہ تو میں بھی جانتا ہوں ــــ مگر وہ کہتا ہے مجھے صرف یہ خبر ملی تھی کہ وہ یہاں آرہا ہے ٹھہرا کہ آیا ہوں۔ تم لوگ ادھر چلے جاؤ نا۔

ساجدہ : چلتا کرو۔ کیا مصیبت ہے ۔۔ چائے بھی بنانا پڑے گی خواہ مخواہ۔

احسان علی : بھئی جب وہ گھر میں آگیا ہے تو اسے کچھ دیر یہاں ٹھہرانا ہمارا فرض ہے۔ کیا کہے گا وہاں جا کر۔

ساجدہ : اچھا ــــ مصیبت ہے خواہ مخواہ کی

احسان علی : رحمت ! تم جا کر اسے یہاں لے آؤ۔

رحمت : اچھا — میاں جی — !

(ساجدہ، ثریا جبیں اور رحمت تینوں کمرے سے نکل جاتی ہیں — احسان علی دروازے کے پاس کھڑا رہتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد ظفر آتا ہے۔ مگر اس منظر اور باقی دو منظروں میں اسے اشفاق ہی کہا جائے گا — اس وقت وہ بڑھیا چاکلیٹ رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ بائیں بازو پر اوورکوٹ لٹکا رکھا ہے سر پر فلیٹ ہیٹ ہے)

احسان علی : آئیے صاحب ! (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تشریف رکھئے (اشفاق اوورکوٹ کرسی کی پشت پر رکھ دیتا ہے) آپ کے دوست تو نہیں آسکے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں۔ خیر یہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے —

اشفاق : بہت ممنون ہوں — واقعہ یہ ہے کہ ابا جان کو یہاں ایک صاحب سے کچھ رقم وصول کرنا تھی — وہ خود تو ان معاملات میں پڑتے نہیں۔ ویسے بھی حکومت بہاول پور نے انھیں تار دے کر بلا لیا ہے — یہاں مجھے آنا پڑا — پرسوں ظفر صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ وہ شام میرے ہوٹل میں آئیں گے — ذرا اچھا وقت گزرے گا — شام کیا کل سارا دن ان کا منتظر رہا — نہ آئے تو میں نے سوچا چلو میں خود ہی جاکر مل آؤں۔

احسان علی : وہ تو اس وقت کراچی میں ہوں گے۔

اشفاق : آپ بتا چکے ہیں۔
احسان علی : اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟
اشفاق : دو ایک روز اور ٹھہرنا پڑے گا ــ وہ صاحب رقم کا انتظام کر رہے ہیں۔
احسان علی : رقم کتنی ہے؟
اشفاق : بائیس ہزار ہے ۔ دس ہزار تو کہتے ہیں فراہم کر لیا ہے اور بنک میں جمع بھی کرا دیا ہے ۔ بقیہ رقم کا جلد انتظام ہو جائے گا ۔ قرض دے کر وصول کرنا بڑی مصیبت ہے قبلہ!
احسان علی : جی ہاں
اشفاق : وہ تو کہیے ۔ میں خود آ گیا ۔ ابا جان تو اس جھنجھٹ میں پڑتے ہی نہیں
احسان علی : اچھا؟
اشفاق : جی ہاں ۔ انھیں کہاں فرصت ویسے بھی ان الجھنوں میں نہیں پڑتے قرض دریا دلی سے دے دیا کرتے ہیں اور وصول ہمیں کرنا پڑتا ہے کبھی رقم وصول ہو جاتی ہے اور کبھی نہیں۔
احسان علی : ایک منٹ ــ میں ذرا چائے لے آؤں۔
اشفاق : اس کی ضرورت نہیں قبلہ! ــ آپ بالکل تکلیف نہ کریں!
احسان علی : نہیں برخوردار ۔ ذرا ٹھہرو ۔ ابھی آیا ۔

(احسان علی کمرے سے نکل جاتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم اپنے سامنے وہی کمرہ دیکھتے ہیں جو دوسرے منظر میں دیکھ چکے ہیں۔ صبح کے آٹھ نو کا عالم ہوگا۔ اشفاق مغربی دیوار کا رُخ کئے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس وقت وہ پاجامے، قمیص اور سوئٹر میں ملبوس ہے چھاتی پر تولیہ پھیلا ہوا ہے۔ آگے میز پر بُرش، صابن، بلیڈ اور شیشے کا گلاس پڑا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی ابھی شیو کرکے فارغ ہوا ہے۔

کرسی کے قریب اس کا اٹیچی کیس بھی پڑا ہے۔

اشفاق چھاتی سے تولیہ ہٹا کر چہرہ پونچھتا ہے — پھر اسے کرسی کے بازو پر پھیلا کر شیو کا سامان سمیٹنے لگتا ہے احسان علی آتے ہیں۔ اشفاق تعظیماً کھڑا ہوجاتا ہے)

اشفاق : آداب عرض قبلہ!

احسان علی : جیتے رہو میاں! — رات نیند آئی، کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی اشفاق میاں؟

اشفاق : جی نہیں تکلیف قطعاً کوئی نہیں ہوئی کس قدر شرمندہ ہوں میری وجہ سے آپ اتنی تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔

احسان علی : ایسی باتیں ٹھیک نہیں۔ آپ اپنے برخوردار کے دوست ٹھہرے اس لیے ہمارے بھی عزیز ہیں۔

اشفاق : یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ جس خلوص اور محبت سے میری خاطر مدارت کر رہے ہیں اسے دیکھ دیکھ کر میں نادم ہُوا جاتا ہوں۔

احسان علی : ہم نے خاطر مدارت کیا کی ہے صاحب! جب آپ کا اپنا گھر یہاں موجود ہے تو پھر ہوٹل میں ٹھہرنا تو ایک غیر مناسب بات معلوم ہوتی ہے۔ ظفر کو چاہیے تھا کہ وہ تمھیں یہیں ٹھہرنے کو کہتا!

اشفاق : یہ کیونکر ہو سکتا تھا قبلہ! — مجھے تو آپ کے دولت کدے کا علم بھی نہ ہوتا — معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ یونہی باتوں باتوں میں ذکر آ گیا کہ آپ فلاں جگہ رہتے ہیں۔ یہ پتہ مجھے یاد رہا — اتفاق ہے ورنہ حافظہ بہت کمزور ہے — میرا خیال ہے وہ انٹرویو سے فارغ ہوتے ہی ادھر چلا آئے گا — تین چار دن کے بعد!

احسان علی : اچھا صاحب! آج کا پروگرام کیا ہے؟

اشفاق : پروگرام تو کوئی خاص نہیں۔ ان صاحب کے ہاں جاؤں گا ذرا۔ بقیہ رقم کا انتظام تو کر رہے ہیں۔ سوچتا ہوں اب بڑی مشکل سے وقت نکال کر آیا ہوں تو کام کر کے ہی جاؤں۔ پھر کون آئے گا یہاں اور کون

وصول کرے گا ان سے بقیہ رقم۔

احسان علی : کیوں برخوردار!

اشفاق : ہمارے ابا جان کی عجیب عادت ہے۔ جو کوئی جتنا روپیہ مانگتا ہے فوراً دے دیتے ہیں۔ ان صاحب کو انھوں نے بائیس ہزار روپیہ دیا تھا — اور پھر ابا جان سے ایک گاڑی بھی لے لی تھی انھوں نے۔

احسان علی : گاڑی لے لی تھی۔

اشفاق : جی ہاں — ابا جان دو سال سے زیادہ کوئی گاڑی اپنے ہاں نہیں رکھتے — اُکتا جاتے ہیں۔ تین چار گاڑیاں وہ اپنے دوستوں کو دے چکے ہیں۔

احسان علی : مفت؟ (بڑے غور سے اشفاق کی طرف دیکھتے ہوئے) قیمت نہیں لی گاڑیوں کی؟

اشفاق : یہی تو میں عرض کرتا ہوں کہ عجیب عادت ہے ان کی۔ کوئی دوست خود کچھ دے دے تو دے دے وہ کچھ نہیں مانگیں گے — یہ صاحب جو گاڑی لائے تھے۔ پندرہ ہزار کی تھی۔ دیکھیے کیا دیتے ہیں — دیتے بھی ہیں یا نہیں۔

احسان علی : دیں گے کیوں نہیں؟

اشفاق : میں نے ابھی ذکر نہیں کیا — ابا جان نے بھی کہہ دیا تھا بیٹا گاڑی

کہ پیسے خود نہ مانگنا ۔ بس ذکر کر دوں گا برسبیل تذکرہ ۔

احسان علی : آپ کے ابا جان کا شغل کیا ہے برخوردار !

اشفاق : انجینئر ہیں ۔ اللہ کے فضل سے ان کا شمار ملک کے ان دو چار انجینئروں میں ہوتا ہے جن کی شہرت ملک کے باہر بھی پھیل چکی ہے ۔ حکومت جب بھی کوئی نیا پلان بناتی ہے تو ابا جان کو مشورے کے لیے ضرور بلایا جاتا ہے ۔ حال ہی میں حکومت نے دس منزلہ عمارت کا نقشہ مانگا ہے ابا جان نے ابھی ادھر توجہ نہیں کی ۔ بہاول پور میں کام بہت پھیلا ہوا ہے ۔ مہینے میں ایک دو بار ادھر جاتے ہیں ۔۔۔ ایک سال سے پہلے یہ کام ختم نہیں ہو گا ۔

احسان علی : خوب ، خوب ، تم خود کیا کام کرتے ہو ؟

اشفاق : قالینوں کا کاروبار ہے ۔۔ یہاں تو ہماری قالینوں کی خاص کھپت نہیں ۔ باہر ہمارا مال ہر سال کافی مقدار میں چلا جاتا ہے ۔

احسان علی : بڑا اچھا کاروبار ہے ۔

اشفاق : اللہ کی مہربانی ہے ۔۔۔ لاکھ سوا لاکھ کی بچت ہو جاتی ہے سال میں ۔ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی شریک ہے ۔

احسان علی : اچھا برخوردار تم نہانا پسند کرتے ہو تو پانی دو منٹ میں گرم ہو جاتا ہے ۔

اشفاق : نہیں قبلہ ! اب تو میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔

احسان علی : کیوں ؟

اشفاق : بڑی مصروفیت رہتی ہے۔ بڑی مشکل سے یہ وقت نکالا تھا۔

احسان علی : اس طرح آپ نہیں جا سکتے۔ میری بیگم نہیں جانے دیں گی۔
معلوم نہیں وہ کیا کیا اہتمام کر رہی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

اشفاق : اب آپ شرمندہ نہ کریں۔

احسان علی : ایک منٹ ٹھہریے۔ ابھی حاضر ہوتا ہوں۔

(احسان علی دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ اشفاق خود بخود مسکراتا ہے اور شیو کا سامان سمیٹنے لگتا ہے۔ اٹیچی کیس اٹھاتا ہے ، اسے میز پہ رکھ دیتا ہے اور اس کا ڈھکنا کھول کر یہ چیزیں اندر ڈال دیتا ہے۔ ساجدہ آتی ہے)

ساجدہ : کیوں بیٹا ! کیا بات ہے تکلف سے کیوں کام لیتے ہو۔ یہ تمھارا اپنا گھر ہے۔

اشفاق : میں اس ذرّہ نوازی کے لیے بہت ممنون ہوں — کوئی تکلف تو نہیں کیا میں نے۔

ساجدہ : پہلے غسل کر لو— اس وقت تک ناشتہ بھی تیار ہو جائے گا۔
— آج کوئی کام تو ہے نہیں — غالباً پہلی مرتبہ یہاں آئے ہو۔
ہمارا شہر چھوٹا سا ہے مگر بڑا خوبصورت ہے۔ ذرا سیر کا پروگرام بن

جائے تو کیا حرج ہے!

اشفاق : مجھے آج کوئی کام تو نہیں — صرف ایک صاحب سے ملنا ہے۔

ساجدہ : میری ثریا جبیں کے ابّا جان نے بتایا ہے کہ تمھیں کسی سے کافی رقم وصول کرنا ہے۔

اشفاق : جی ہاں یہ قضیہ تو ہے

ساجدہ : یہ تو ایک آدھ گھنٹے کا کام ہے زیادہ سے زیادہ۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہاں چلے جانا۔ اس کے بعد ذرا گھوم آئیں گے۔

اشفاق : آپ کی بڑی مہربانی — مجھے زیادہ شرمندہ نہ کیجیے۔ اب واپس جانے کی اجازت دے دیجیے۔ سیر کا پروگرام پھر کبھی سہی — ظفر کے ساتھ۔

ساجدہ : (جلدی سے) نہیں بیٹا اس طرح تو تم جا نہیں سکتے — اپنی ثریا جبیں کے ابّا جان یہیں ڈاکٹر صاحب کے ہاں جا کر فون کر دیں گے — ٹیکسی آجائے گی — دو تین گھنٹوں میں واپس آجائیں گے!

اشفاق : غلطی دراصل مجھ سے ہوئی — اپنی گاڑی میں نہ آسکا۔

ساجدہ : تمھاری گاڑی خراب تھی بیٹا؟

اشفاق : جی نہیں — سسٹر پک نک پر جا رہی تھی۔ بھائی اپنی گاڑی میں ذرا باہر گیا تھا۔ میں نے اس کا انتظار نہ کیا اپنی گاڑی ہی سسٹر کے حوالے کر دی۔

ساجدہ : کوئی بات نہیں ۔ تمہاری سسٹر کالج میں پڑھتی ہوں گی ؟

اشفاق : جی ہاں ۔ بی ۔ ایس ۔ سی کی سٹوڈنٹ ہیں ۔

ساجدہ : اللہ رکھے میری ثریا جبیں بی اے کر چکی ہے ، اگلے سال ایم اے میں داخل ہو جائے گی ۔ داخلہ تو اس سال لے لیتی مگر بدقسمتی سے اس کے ماموں کا انتقال ہو گیا ۔ چھیا کو اپنے ماموں سے بڑی محبت تھی ۔ بڑا دُکھ ہوا بیچاری کو ۔ میں نے سوچا اسے اس سال داخل نہ کراؤں محنت سے کمزور ہو جائے گی ۔ ویسے لائق اس قدر ہے کہ ہر امتحان میں آج تک اوّل رہی ہے ۔

(احسان علی آتے ہیں)

احسان علی : تو کیا رہا پروگرام ؟

ساجدہ : (مسکرا کر ، شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے) بڑا شرمیلا بچہ ہے ۔ توبہ

احسان علی : نیک والدین کے ایسے ہی بچے ہوتے ہیں ۔

ساجدہ : پانی دو منٹ میں گرم ہو جاتا ہے ۔ غسل کر لو ، پھر کچھ سوچا جائے گا ۔

احسان علی : وہ تو میں نے انتظام کر دیا ہے ۔ رحمت حمام میں کوئلے ڈال رہی ہے ۔

ساجدہ : بہتر ۔ تو بیٹا ابھی تمہیں غسل خانے میں بھیج دیں گے ۔ دو منٹ

کی بات ہے۔ اس کے بعد ناشتہ اور پھر سیر۔ اس کے بعد پروگرام بنالیں گے۔

اشفاق : دیکھئے۔

ساجدہ : دیکھئے دیکھئے کچھ نہیں۔

(جلدی سے چلی جاتی ہے۔ احسان مسکرا کر اشفاق کی طرف دیکھتے ہیں اور پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

(وہی ڈرائنگ روم۔ اشفاق کرسی پہ بیٹھا اخبار دیکھ رہا ہے۔ ثریا جبیں ٹرے میں چائے اور ناشتے کا سامان لے کر آتی ہے۔ اس وقت وہ گہرے سرخ رنگ کی ساری پہنے ہوئے ہے۔ چہرہ پوڈر اور لپ اسٹک سے مزین ہے۔ اس منظر میں وہ جتنی باتیں کرے گی آنکھیں مٹکا مٹکا کر اور مسکرا مسکرا کر کہے گی۔

اشفاق اخبار سے نظر ہٹا کر ثریا جبیں کو دیکھتا ہے۔ وہ ذرا جھینپتی ہے۔ پھر آگے بڑھتی ہے۔ اشفاق جلدی سے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لیتا ہے اور میز پہ رکھ دیتا ہے)

اشفاق : آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟

ثریا جبیں : جی۔ تکلیف کی تو کوئی بات نہیں۔ رحمت اس وقت گھر میں تھی

نہیں۔ اماں جان کہنے لگیں انھیں ناشتے میں دیر ہو جائے گی ۔۔ اس لئے
آپ بیٹھ جائیں نا۔

اشفاق : آپ لوگ اس قدر شرمندہ کر رہے ہیں کہ میں پچھتا رہا ہوں کہ یہاں
کیوں آگیا۔

ثریا جبیں : آپ پچھتا رہے ہیں ۔ اوہ ۔ سچ مچ

اشفاق : جی ہاں

ثریا جبیں : یہ بات کہہ کر آپ ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں ۔ ہماری پوزیشن
کچھ AWKWARD سی ہو جاتی ہے۔

اشفاق : وہ کیوں ؟

ثریا جبیں : ہم تو صرف اپنی ڈیوٹی پوری کر رہے ہیں۔ آپ ہمارے
GUEST ہیں۔

(ثریا جبیں اشفاق کے سامنے کرسی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اشفاق بھی بیٹھ جاتا
ہے)

شروع کیجیے۔

اشفاق : میں بڑا ہلکا ناشتہ کرنے کا عادی ہوں۔

ثریا جبیں : یہ HEAVY کہاں ہے ؟ PLEASE (حلوے کی
طشتری اشفاق کی طرف بڑھاتے ہوئے) HAVE SOME THING

(اشفاق ایک خالی طشتری میں تھوڑا سا حلوہ لے لیتا ہے)

اتنا تھوڑا۔

اشفاق : میں نے کھانا ناں

ثریا جبیں : اماں جان نے بتایا ہے آپ کی سسٹر بی۔ ایس سی میں پڑھتی ہیں

اشفاق : جی ہاں

ثریا جبیں : انھیں کبھی ادھر بھیجئے ــــ میرا ارادہ بھی ایم۔ ایس سی کا تھا مگر بی۔ اے میں ایک پروفیسر کے اصرار پر آرٹس لے لیے۔

اشفاق : اپنے اپنے ذوق کی بات ہے

ثریا جبیں : عجیب بات ہے ــ میرا ٹیسٹ سائنس کے لیے بھی ہے اور آرٹس کے لیے بھی۔

اشفاق : خوب

ثریا جبیں : آپ کو ہمارا شہر تو پسند آیا نا۔ چھوٹا سا ہے۔ کیا پسند آیا ہوگا؟

اشفاق : بہت پسند ہے

ثریا جبیں : (انڈوں والی طشتری اشفاق کی طرف بڑھاتے ہوئے) یہ لیجیے۔ آپ تو (مسکرا کر اشفاق کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

اشفاق : میں انڈا نہیں کھا سکوں گا۔ شکریہ!

ثریا جبیں : اوہ ــ آل رائٹ۔ چائے بناؤں؟

اشفاق : آپ خود بھی تو لیجئے نا۔

ثریا جبیں : میں بیڈ ٹی کے بعد دس بجے ناشتہ کرتی ہوں۔ یہ میری HABIT ہے (چائے بناتے ہوئے) HOW MUCH

اشفاق : دو چمچ

ثریا جبیں : ALRIGHT ڈیڈی کہہ رہے تھے۔ آج آپ چلے جائیں گے

(پیالی اشفاق کی طرف بڑھاتے ہوئے)

اشفاق : جی ہاں کاروبار کا معاملہ ہے۔

ثریا جبیں : آپ تو بڑے BUSY رہتے ہوں گے!

اشفاق : بہت زیادہ

(ثریا جبیں اپنے لیے چائے کی پیالی بنانے لگتی ہے)

ثریا جبیں : تو اپنی سسٹر کو کب ساتھ لائیں گے؟

اشفاق : کہہ نہیں سکتا مصروفیت بہت زیادہ رہتی ہے

(دونوں چائے پیتے ہیں)

ثریا جبیں : پھر بھی۔

اشفاق : وعدہ نہیں کر سکتا۔۔ بہت مشکل ہے وعدہ کرنا۔

ثریا جبیں : دو ایک دن کی فرصت نکالیے۔ کاروبار تو آپ کا اپنا ہے۔

اشفاق : کوشش کروں گا۔

ثریا جبیں: THANKYOU

اشفاق: کوشش یہی ہوگی کہ کسی دن آجاؤں۔

(ساجدہ آتی ہے)

ثریا جبیں: (ماں سے) امّاں! یہ تو کچھ کھاتے ہی نہیں۔ بڑے درویش قسم کے آدمی ہیں۔

ساجدہ: اشفاق بیٹا! کیا کہہ رہی ہے میری بچّی!

اشفاق: وہ تو میں نے پہلے عرض کر دیا ہے۔ ناشتہ بہت ہلکا کرتا ہوں۔

ساجدہ: اپنا گھر ہے ـــ تکلّف نہیں کرنا چاہیے خیر ـــ (ثریا جبیں سے) چھیا بیٹی رحمت آگئی ہوگی۔ اس سے کہو کہ برتن لے جائے۔

ثریا جبیں: بہت اچھا ـــ

(ثریا جبیں اُٹھ کر دروازے سے نکل جاتی ہے)

ساجدہ: میں نے کہا اشفاق بیٹا! بہتر یہ ہے کہ تم دوپہر کا کھانا کھا کر جاؤ۔

اشفاق: اب تو بہت دیر ہوگئی ہے۔ اجازت ہی دے دیں۔

ساجدہ: تمھاری مرضی ـــ (اشفاق کے قریب آکر کرسی میں بیٹھتے ہوئے) اشفاق بیٹا!

اشفاق: جی۔ فرمائیے۔

ساجدہ: کل شام میں نے ایک بات کا اشارہ کیا تھا۔

(اشفاق نگاہیں جھکا لیتا ہے جیسے شرم محسوس کر رہا ہو)

اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ماشاءاللہ پڑھے لکھے ہو اور پھر تم کہتے ہو کہ تمہارے والدین نے کہہ دیا ہے جہاں کہو گے تمہاری شادی کر دی جائے گی۔ ٹھیک ہے ناں۔

(اشفاق خاموش رہتا ہے۔ رحمت آتی ہے اور ٹرے میں سامان رکھ کر جانے لگتی ہے)

سوچ کیا رہے ہو۔

اشفاق: کیا عرض کروں؟

ساجدہ: یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے بیٹا!

اشفاق: یہ تو درست ہے کہ ابا اور امی میرا رشتہ وہیں کریں گے جہاں میں چاہوں گا۔ مگر

ساجدہ: مگر کی کیا بات ہے؟

اشفاق: ظفر میرا دوست ہے ۔۔ آپ کی اس سے بات طے ہو چکی ہے۔ یہ تو غیر مناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ۔۔

ساجدہ: اس کی فکر نہ کرو بیٹا! میں نے اور ثریا کے ڈیڈی نے تو آج تک اُس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ قصہ صرف یہ ہے کہ ظفر کی بہن میری ثریا کے

ساتھ کالج میں پڑھ چکی ہے۔ ایک مرتبہ یہاں بھی آئی تھی۔ ہم آج تک اس کے ہاں نہیں گئے ۔ اور پھر لڑکی والے جب چاہیں انکار کر سکتے ہیں — ہیں بیٹا!

اشفاق: ظفر اور اس کے گھر والے تو یہی سمجھتے ہیں نا کہ — اور ظفر کو تو آپ نے بلایا بھی ہے۔

ساجدہ: وہ بات ختم ہوئی بیٹا! — اس کی مطلقاً پروا نہ کرو میں کہتی ہوں۔ مجھے تم جیسا لائق بیٹا ملے تو ادھر کیوں دیکھوں گی۔ کیا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے خدانخواستہ۔ میری ثریا جبیں کے ڈیڈی تو تمہاری تعریف کرتے کرتے نہیں تھکتے۔ اور ثریا کی سنو (مسکرا کر) آج صبح ہی کہہ رہی تھی میں ان کے لیے اُون خرید لاؤں گی سویٹر بُننے کے لیے۔ کیا کہوں بیٹا! — ماں کو اپنی بیٹی کی تعریف نہیں کرنی چاہیے۔ — مگر حقیقت یہ ہے کہ ثریا کی ذہانت کی ہر جگہ دُھوم ہے۔ ایک سویٹر بنایا ہے اپنے ڈیڈی کے لیے خاندان بھر میں اسے سراہا جا رہا ہے — تمھیں دکھاتی مگر اس وقت اس کی خالہ زاد بہن نمونے کے لیے لے گئی ہے۔

اشفاق: میں صرف یہی عرض کر رہا تھا کہ ظفر میرا دوست ہے۔

ساجدہ: اس کا ذکر نہ کرو۔ میں آج ہی ان لوگوں کو خط لکھ دوں گی — معاملہ ختم ہو جائے گا ایک خط لکھ دینے سے۔

اشفاق : ایسا مناسب ہو گا کیا ؟

ساجدہ : کہہ تو چکی ہوں بیٹی والے جب چاہیں انکار کر سکتے ہیں ۔ کیا ہمیں اپنی بیٹی کے مستقبل کا خیال نہیں — تو بیٹا !

(اشفاق خاموش رہتا ہے)

کیا پوچھ رہی ہوں اشفاق ؟

اشفاق : یہی سوچ رہا ہوں کہ کیا جواب دوں !

ساجدہ : بس سمجھ لیا شرماتے ہو ۔

اشفاق : کچھ عرض کر نہیں سکتا ۔

ساجدہ : عرض کرنے کی ضرورت بھی نہیں

(ساجدہ محبّت سے اشفاق کا سر چومتی ہے)

ہاں تم نے اپنا پتہ تو بتایا نہیں

اشفاق : گھر جا کر خط لکھوں گا ۔

ساجدہ : جاتے ہی سب سے پہلے یہی کام کرنا — سُن لیا نا بیٹا ۔

(اشفاق اثبات میں سر ہلاتا ہے اور پردہ گرتا ہے)

پانچواں منظر : ظفر کا کمرہ

نگہ اب یہاں پہلی سی نفاست دکھائی نہیں دیتی ۔ میز پر کتابیں بکھری پڑی ہیں ۔ میز پر

ایک طرف ٹرے نظر آرہی ہے۔ جس میں ایک گلاس اور دو خالی پیالیاں پڑی ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ چار پانچ روز سے کمرے کی صفائی نہیں کی گئی۔
اس وقت ظفر ایک کرسی پر بیٹھا ہے ـــ اپنے داہیں ہاتھ کی انگلیاں سر پر پھیر رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قدرے بے چین ہے۔ سامنے ٹائم پیس کی چھوٹی سوئی پانچ پر ہے ـــ حالانکہ اس وقت نو بجے ہیں۔
فہمیدہ آتی ہے اور ٹائم پیس کی طرف دیکھ کر مسکرا پڑتی ہے)

فہمیدہ : یہ کیا مصیبت ہے بھیا!

ظفر : خیر تو ہے ؟

فہمیدہ : ارے دیکھتے نہیں۔ پانچ بج رہے ہیں اور تم نے سارا دن یہیں بیٹھے بیٹھے گزار دیا ہے۔

ظفر : ابھی تو نو بجے ہوں گے زیادہ سے زیادہ

فہمیدہ : تمھارا ٹائم پیس کیا بتا رہا ہے ـــ دیکھو تو ـــ اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ گھڑی کو چابی ہی لگا دیتے۔

ظفر : یہ سب کام تو موداں کیا کرتی تھی۔ اسے تم لوگوں نے ماموں کے ہاں بھیج دیا ہے میرے چلے جانے کے بعد۔

فہمیدہ : ہم نے کب بھیجا تھا ـــ خود ہی چلی گئی ہے ـــ امی نے بہتیرا روکا۔ ـــ میں نے بھی روکا، نہیں مانی۔ خیر یہ تو ہوتا ہی رہے گا۔ تم کب جا رہے ہو

وہاں ؟

ظفر : وہاں کہاں ؟

فہمیدہ : ہائے کتنے بھولے بنتے ہیں۔

ظفر : منٹگمری ؟

فہمیدہ : اور کہاں ؟ ۔ خط لکھ دوں بھیا واپس آ گئے ہیں کراچی سے انٹرویو دے کر اور اب پیر کے روز آئیں گے آپ کے ہاں۔ ٹھیک ہے ناں۔

ظفر : ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے ۔ سب کچھ ٹھیک ہے ۔ (مسکراتا ہے)

فہمیدہ : اب مسکرا رہے ہو ۔ کیا بات ہے ؟

ظفر : کوئی بات نہیں

(فاطمہ آتی ہے۔ بوڑھی عورت ۔ لباس عام۔ ہاتھ میں لفافہ ہے)

فاطمہ : فہمی بھئی !

فہمیدہ : جی امی جان !

فاطمہ : یہ دیکھو رجسٹری آئی ہے ۔ منٹگمری سے ۔ پڑھو ذرا

(فہمیدہ لفافہ چاک کرتی ہے ۔ اس کی نگاہیں تحریر پر جم جاتی ہیں اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے)

فہمیدہ : امی ! (منہ میں انگلی ڈال لیتی ہے) یہ ہوا کیا ؟

فاطمہ : (پریشان ہو کر) کیا ہے ؟

فہمیدہ : یہ کیا لکھا ہے ثریا کی ماں نے ؟

ظفر : کیا ہے — بتاتیں کیوں نہیں باجی ؟

فاطمہ : کیا کہہ رہی ہے تو۔ فہمی ؟

فہمیدہ : امّی! ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں! — عجیب بات بنی ہے!

فاطمہ : صاف صاف کہو کیا ہے ؟

فہمیدہ : ثریّا جبیں کی ماں نے لکھا ہے —

فاطمہ : یہی تو میں پوچھتی ہوں لکھا کیا ہے ؟

فہمیدہ : لکھا ہے — سنئیے امی! "ہمیں بڑا افسوس ہے کہ یہ رشتہ ہمیں منظور نہیں۔ آئندہ اس سلسلے میں ہمیں کوئی خط نہ لکھا جائے۔ اس معاملے کو ہمیشہ کے لیے ختم سمجھ لیا جائے۔ ویسے ہمارا گھر تمہارا اور تمہاری امّی کا اپنا گھر ہے امید ہے کہ گھر میں ہر طرح خیریت ہوگی۔ فقط والدہ ثریا جبیں۔"

فاطمہ : یہ ہوا کیا ان لوگوں کو!

ظفر : میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ یہ حادثہ ایک نہ ایک دن ضرور پیش آئے گا یہ خبر سن کر مجھے تو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

فاطمہ : یہ ہوا کیا — یک دم سب کچھ ختم۔ بغیر کسی وجہ سے ؟

فہمیدہ : میں تو سمجھتی تھی بڑے شریف لوگ ہیں۔

فاطمہ : اچھی شرافت دکھائی ہے اپنی۔ نہ کوئی وجہ، نہ سبب بس ہمیں یہ رشتہ

منظور نہیں — آخر کیوں یہ معمّا کیا ہے؟

ظفر: امّی! ایک بالکل معمولی بات کو آپ معمّا سمجھ رہی ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا یہ لوگ لالچی معلوم ہوتے ہیں جب کوئی مالدار رشتہ نظر آئے گا ہمیں فوراً ٹھکرا دیں گے۔ چنانچہ وہی ہوا میں کہتا نہیں تھا کہ بعض لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی لڑکوں سے نہیں موٹر کاروں اور بنگلوں سے کرتے ہیں یہ لوگ بھی بالکل ویسے ہیں۔

فہمیدہ: امّی اب تو انہیں کچھ لکھنا قطعاً فضول ہے۔

فاطمہ: اب کیا لکھا جائے گا — گنجائش کہاں چھوڑی ہے اُنھوں نے؟

ظفر: اُنھوں نے تو صاف لکھ دیا ہے کہ اب اس سلسلے میں کوئی خط نہ لکھا جائے اور اس معاملے کو — خط دکھانا باجی ذرا (خط لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے)

فہمیدہ: سُن تو لیا ہے تم نے (خط ظفر کو دیتے ہوئے) دیکھ لو اپنی آنکھوں سے بھی!

فاطمہ: عجیب معاملہ ہے — خیر دفع کرو۔

(فاطمہ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ فہمیدہ بھی ان کے پیچھے چلی جاتی ہے۔ ظفر اکیلا رہ جاتا ہے۔ اپنی نگاہیں تحریر پر ڈالتا ہے اور مسکرانے لگتا ہے — تین چار لمحے تحریر کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر کاغذ تہ کرکے میز پر رکھ دیتا ہے فہمیدہ آتی ہے)

ظفر : باجی ! اب کہو

فہمیدہ : کیا کہوں ؟

ظفر : دیکھ لی ہے نا ان کی ذہنیت ــــ میں تو جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

فہمیدہ : دفع کرو ــ نہ جانے کیسے لوگ ہیں ــ تم سچ ہی کہتے تھے۔ لالچی ہی ثابت ہوئے کوئی دولت مند رشتہ مل گیا ہو گا !

ظفر : جب میں لالچی کہتا تھا اس وقت نہ مانا ــــ اب اُنھوں نے صاف انکار کر دیا ہے تو لالچی سمجھے جانے لگے۔ خیر اب ارادہ کیا ہے تمھارا اور امّی کا ؟

فہمیدہ : وہی جو تمھارا ہے۔

ظفر : میرا کیا ارادہ ہے ؟

فہمیدہ : بھولے کیوں بنتے ہو ــ گویا جانتے ہی نہیں۔ امّی نے کہہ دیا ہے۔

ظفر : امّی مان گئی ہیں

فہمیدہ : ہاں ــ کل محمودہ کے ماموں کے ہاں جائیں گی۔

ظفر : وہ کیا کہاوت ہے صبح کا بھولا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہیے ــــ خیر یہ قصّہ تو ختم ہُوا۔ باجی ! مجھے ذرا اپنا پیڈ دینا میرا پیڈ ختم ہو چکا ہے اور مجھے اس وقت ایک ضروری خط لکھنا ہے۔

فہمیدہ : خط کہاں لکھنا ہے ؟

ظفر : جہاں انٹرویو دینے گیا تھا۔

فہمیدہ : انٹرویو دینے گئے تھے تو خط لکھنے کی ضرورت!

ظفر : کوئی خاص ضرورت تو نہیں تاہم انٹرویو لینے والوں نے میرے ساتھ جس دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ اس کے لیے ان کا شکریہ تو ادا ضرور کرنا چاہیے — باجی تم یہ بات نہیں سمجھتیں — دنیا میں بعض بڑے عجیب و غریب انٹرویو ہوتے ہیں۔

(فہمیدہ بھائی کو استفسار طلب نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور پردہ جلدی سے گرتا ہے)

اسفنج

افرادِ تمثیل

بی بی جی

غفوراں

ہمدانی

زینت

احمد رضا

اور

دو تین مرد عورتیں

پہلا منظر

(بی بی جی کا کمرہ - ایک روشن دن - وقت صبح کے دس بجے، کمرے میں نظر ڈالتے ہی پہلا احساس یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی مالکن ایک دولت مند خاتون ہیں — فرش پر دری، درمیان میں قالین - دیواروں پر طغرے، بزرگانِ دین کے مقبروں اور تاریخی مساجد کی تصویریں - سامنے دیوار پر ایک بڑا سا کلاک - نیچے ایک شان دار پلنگ — صاف ستھرا بستر بچھا ہوا - دیوار کے ساتھ گاؤ تکیہ — اسی دیوار کے پاس ایک آرام کرسی، پلنگ کے پاس دو کرسیاں - دونوں کا رُخ ایک دوسرے کے سامنے، درمیان میں ایک تپائی — تپائی کے اوپر چاندی کا ایک خوبصورت پاندان - دو دروازے —ایک دائیں دیوار میں — اور دوسرا بائیں دیوار میں — دونوں پر سبز پردے پڑے ہوئے - پردہ اُٹھنے پر بی بی جی پلنگ کے اوپر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہیں — اس وقت پان لگانے میں مصروف ہیں - بی بی جی ٹھگنے قد کی فربہ اندام عورت ہیں - چہرہ چپٹا - ناک ذرا بیٹھی ہوئی - کانوں میں

سُنہرے بندے۔ ہاتھوں میں وزنی طلائی کڑے اور چُوڑیاں، لباس قمیص شلوار اور دوپٹہ۔ عمر پنتالیس کے لگ بھگ ۔ ممکن ہے اس سے بھی زیادہ ہو۔ دل کی مریضہ، ذرا سا صدمہ پہنچے تو ہاتھ بے اختیار سینے پر رکھ دیتی ہیں۔ جیسے دل کی حرکت بند ہو جانے کا خدشہ پیدا ہو گیا ہو — باتیں کرتے وقت پلکیں جھپکاتی رہتی ہیں۔ بی بی جی پان لگا کر مُنہ میں ڈالتی ہیں۔ انگلی پر چونا رکھ کر زبان سے لگاتی ہیں اور بائیں دروازے کی طرف دیکھتی ہیں۔ غفوراں آتی ہے۔ غفوراں بی بی جی کی ہم عمر ہے۔ بات کرتے وقت عموماً سر ہلاتی رہتی ہے۔ بی بی جی خشمگیں نظروں سے غفوراں کو دیکھتی ہیں۔ غفوراں تپائی کے پاس آکر بستر کی شکن درست کرنے لگتی ہے)

بی بی جی: اتنی دیر سے چیخ رہی ہوں — کہاں تھی تُو؟

غفوراں: صاب کے کمرے میں بیب جی! صفائی کر رہی تھی!

بی بی جی: ہاں آج ہی تو صفائی کا خیال آئے گا تجھے۔ ابھی آ جو رہے ہیں وہ۔

غفوراں: نہیں بیب جی!

بی بی جی: پرسوں ترسوں سے کہہ رہی ہوں۔ صاب منگل کے روز واپس آ جائیں گے صفائی پہلے پہلے ہو جانی چاہیے۔

غفوراں: بیب جی! ذرا سُن تو لیں آج میں نے کیا کیا ہے — کیا یہ ہے

بیب جی۔ گلدان میں تازہ پھولوں کا گلدستہ سجایا ہے۔ سارا کمرہ مہک اٹھا ہے (مسکراتی ہے) بس اور کیا کرنا تھا بھلا۔ ان کے لیے ریڈیو اور باجا خریدا تھا — انھیں ٹھیک ٹھاک کیا ہے۔ ذرا جا کر دیکھیے تو۔ کتنا اچھا کمرہ بن گیا ہے۔

بی بی جی : (مسکرا کر) اب تو بڑی سمجھ دار ہو گئی ہے تُو۔

(غفوراں مسکراتی ہے — پھر یکایک سنجیدہ چہرہ بنا لیتی ہے۔ رازدارانہ انداز میں اپنا منہ بی بی جی کے کان کے قریب لے جاتی ہے)

کیا ہے؟

غفوراں : ایک بات کہوں بیب جی!

بی بی جی : اللہ خیر کرے!

غفوراں : میں نے کہا بیب جی! اپنے صاب بڑے اچھے ہیں۔ فرشتے ہیں سچ مچ؛ پر دیکھیے ناں!

بی بی جی : دیکھوں کیا؟

غفوراں : اللہ کرے میری زبان جل جائے جو ایسی ویسی بات مُنہ سے نکالوں۔

بی بی جی : (غفوراں کو گھورتے ہوئے) کچھ کہے گی بھی آخر!

غفوراں : میں نے کہا وہ جو نئی عورت آئی ہے نا گھر میں۔

بی بی جی : زینت؟ — کیا ہے اس کو؟؟

غفوراں : ابھی بالکل جوان ہے۔ آپ نے تو اس پہ رحم کھا کے گھر میں رکھ لیا ہے۔ پر کیا پتہ کیسی ہے، کیسی نہیں ہے۔ زمانہ بڑا خراب ہے بیب جی! صاب جی پر ڈورے ڈالنے لگے تو ۔۔ سچ بابا! ڈر لگتا ہے۔

بی بی جی : تو یہ بات ہے۔

غفوراں : ہے تو بڑی اچھی ۔۔ سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہے پر ۔۔ کیا پتہ ان عورتوں کا ۔۔ ہاں بیب جی! سچ کہتی ہوں!

(غفوراں خاص نظروں سے بی بی جی کو دیکھنے لگتی ہے)

بی بی جی : (لہجے میں سنجیدگی) میں نے زمانہ دیکھا ہے غفوراں! سب کچھ جانتی اور سمجھتی ہوں۔ کچھ سوچ کر ہی اسے پناہ دی ہے۔

غفوراں : میں سمجھی نہیں بیب جی!

بی بی جی : وہ اپنا ہے نا ہمدانی۔

غفوراں : ماسٹر جی؟

بی بی جی : ہاں ۔۔ اُسی کے ساتھ اُس کا پلو باندھ رہی ہوں۔

غفوراں : واہ وا ۔۔ بیب جی! سبحان اللہ

بی بی جی : ہمدانی آج ہی آجائے گا ۔۔ کل تار دیا تھا۔

غفوراں : اچھا بیب جی! اب یوں کریں کہ صاب ہمارے سچ مچ کے صاب بن جائیں! (مسکراتی ہے)

بی بی جی: جائداد کا بندوبست کرنے گیا تھا — آج ضرور آجائے گا۔ اس جمعہ کو اللہ کے فضل سے دین اسلام کا فرض پورا ہو جائے گا۔

غفوراں: اس جمعہ کو (لہجے میں مسرت) اللہ یہ جوڑی ہمیشہ خوش رہے۔ دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو — آمین۔

بی بی جی: تجھے پورا جوڑا دوں گی نکاح کے دن۔

غفوراں: اللہ برکت دے۔

بی بی جی: ہاں سنو! غسل خانے کے ساتھ جو کمرہ ہے نا وہ ہمدانی کے لیے ہے۔

غفوراں: وہ تو زینت کے لیے ہے۔

بی بی جی: اور کوئی کمرہ نہیں ہے کیا؟

غفوراں: زینت کے ساتھ والا کمرہ۔۔۔ (مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے) اچھا۔

(غفوراں جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑتی ہے —— دروازے پر ہمدانی آتا ہے۔ ہمدانی دُبلا پتلا آدمی ہے۔ لباس شلوار اور سیاہ رنگ کی اچکن۔ سر پر جناح کیپ۔ آنکھوں پر بغیر کمانیوں کے عینک۔ ہاتھ میں چھڑی پہلی نظر ہی میں اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس شخص کو اپنی شخصیت نمایاں کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ چنانچہ لباس کے معاملے میں بھی بے پروا ہے۔

اچکن میلی ہو چکی ہے اور ٹوپی بھی کافی میلی نظر آتی ہے۔

ہمدانی کی عمر چالیس پینتالیس کے قریب ہو گی۔ بات نگاہیں جھکا کر کرتا ہے۔ پریشانی اور غور و فکر کے عالم میں ٹوپی سر سے اتار کر اسے پنکھے کی طرح جھلنے لگتا ہے ــ سر گنجا ہے)

بی بی جی: اخاہ۔ ماسٹر ہمدانی! ــ آئیے۔

(ہمدانی لمبے لمبے ڈگ بھر کر اندر آتا ہے۔ چھڑی پلنگ پر رکھ دیتا ہے اور بی بی جی کے پاس آکر رک جاتا ہے۔ بی بی جی چھڑی اٹھا کر پلنگ کے ساتھ لگا دیتی ہیں)

ہمدانی: (فکرمندانہ لہجے میں) خیر تو ہے ناں!

بی بی جی: بیٹھ تو جاؤ۔

ہمدانی: معاملہ کیا ہے (کرسی پر بیٹھ کر) پریشان ہو گیا ہوں تار دیکھ کر۔

بی بی جی: اس طرح پریشان ہو جیسے اللہ جانے کیا مصیبت ٹوٹ پڑی ہے۔

ہمدانی: تار دے کر جو بلایا ہے ــ یونہی تو تار نہیں دئے جاتے۔

بی بی جی: ایک بڑی اچھی خوش خبری ہے تمہارے لیے؟

ہمدانی: خوش خبری؟ ــ خوش خبری سنانے کے لیے تار دیا ہے؟

(غفوراں ہنسی روکتے ہوئے جلدی سے دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

بی بی جی: ایک نہیں دو خوش خبریاں!

ہمدانی : ایک نہیں دو۔۔۔

بی بی جی : ہاں دو۔۔ تم جانتے ہو میں تنہا اتنی بڑی جائداد کا انتظام کر ہی نہیں سکتی۔ عورت ذات ٹھہری۔ ایک ہی صورت رہ جاتی ہے جس سے معاملات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔

ہمدانی : ہوں ہوں (اثبات میں سر ہلاتا ہے)

بی بی جی : ہوں ہوں کیا ؟ (ہنستی ہے) نرے ماسٹر ہو۔ بدھو قسم کے۔۔۔ کیا سمجھا ہے

ہمدانی : ابھی تک تو کچھ نہیں سمجھا۔

بی بی جی : میری جائداد کا انتظام کون کر سکتا ہے !

ہمدانی : ہاں ہاں۔۔ کون کر سکتا ہے تمھارے سوا۔

بی بی جی : تو وہ جائداد کا بندوبست کرنے گئے ہیں !

ہمدانی : (سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے) کون ؟

بی بی جی : وہی جو میرے گھر والے بنیں گے۔

ہمدانی : اللہ تیری شان ! (بی بی جی غصے سے ہمدانی کو دیکھتی ہے۔ ہمدانی کو احساس ہو جاتا ہے کہ اُس نے درست بات نہیں کہی) مبارک ہو ۔۔۔ بہت بہت !

بی بی جی : جمعہ کے روز نکاح ہو جائے گا۔

ہمدانی : ہیں کیسے ؟

بی بی جی : دیکھ لینا۔ آجائیں گے آج ہی — ماشاءاللہ پڑھے لکھے ہیں —
کنوارے ہیں اور شکل صورت بھی — ابھی دیکھ ہی لینا !

ہمدانی : کنوارے ؟ (بی بی جی کے چہرے پر سُرخی آجاتی ہے — اثبات میں سر ہلاتی
ہیں) تب تو اور بھی لمبی چوڑی مبارکباد دیں۔

بی بی جی : اور سُنو — جمعہ کے روز تمھارا گھر بھی آباد ہو جائے گا۔

ہمدانی : ہائیں — ؟ میرا گھر ؟؟

(ہمدانی پریشانی میں ٹوپی کو پنکھا بنا لیتا ہے)

بی بی جی : ہاں ہاں تمھارا گھر۔ ساری عمر لنڈھورے ہی رہو گے کیا ؟ (ہمدانی
بی بی جی کو اس طرح دیکھ رہا ہے جیسے ابھی معاملے کی تہ تک نہیں پہنچا) گھبرا کیوں
گئے ہو — اپنا گھر بسانے کا شوق نہیں تمھیں !

ہمدانی : یہ شوق تو اللہ نے تمھیں کو دیا ہے۔ بس۔

بی بی جی : میں تو خیر مجبور ہوں۔ تم اپنی کہو

ہمدانی : تو یہ مال امپورٹ کہاں سے کیا ہے ؟

بی بی جی : یہ تمھارا مال ؟

ہمدانی : اور کیا ؟

بی بی جی : بڑی خوش اطوار عورت ہے۔ بچپن میں شادی ہو گئی تھی۔ عین جوانی

میں شوہر چل بسا۔ والدین زندہ نہیں ہیں۔ سسرال سے نبھ نہیں سکی۔ بیچاری کسی امیر گھر میں بچوں کو پڑھانے لگی۔ گھر والی نے دیکھا کہ اس کا شوہر بچوں کی اُستانی میں دلچسپی لینے لگا ہے تو فوراً اس کو چلتا کیا۔ میرے پاس سہارا ڈھونڈنے کے لیے آگئی تو مجھے تمھارا خیال آگیا!

ہمدانی: اور اب حفظِ ماتقدم کے طور پر میرے گلے باندھی جا رہی ہے۔

بی بی جی: ہمدانی! کون کہتا ہے تمھارا صرف ایک پُرزہ خراب ہے۔ میں تو کہتی ہوں (سر کو انگلی سے ٹھونکتے ہوئے) تمھاری ساری مشین ہی خراب ہو چکی ہے۔ مجھے ایسا خیال ہوتا تو اسے کچھ دے دلا کر رخصت نہ کر دیتی۔ فکر تو مجھے تمھاری تھی ـــ دیکھو گے تو لٹّو ہو جاؤ گے! انشاءاللہ تعالیٰ۔

(بی بی جی دروازے کی طرف رُخ کر کے "غفوراں" بلند آواز میں کہتی ہیں)

ہمدانی: میں تو اس جھنجھٹ سے کوسوں دُور بھاگتا ہوں۔ یہ کیا تماشا لے بیٹھی ہو تم؟

بی بی جی: (مسکرا کر) پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ (غفوراں آتی ہے بی بی جی اس کی طرف مخاطب ہوتی ہیں) زینت کو ادھر بھیج دو۔

غفوراں: (مسکرا کر) اچھا بیب جی۔

(غفوراں دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

ہمدانی : یہ بیٹھے بٹھائے تمھیں سوجھی خوب ہے۔

بی بی جی : ہمدانی! تمھیں کیا خبر — مجھے تمھاری کتنی فکر لگی رہتی ہے۔

ہمدانی : یہ تو میں خوب جانتا ہوں۔

بی بی جی : مہربانی کرکے سر پہ ٹوپی رکھ لو۔

(ہمدانی سر پہ ٹوپی رکھ لیتا ہے)

غفوراں : (دروازے کے اندر آکر — باہر کسی کو دیکھتے ہوئے) آجاؤ نا۔

بی بی جی : زینت ہے!؟

غفوراں : جی بیب جی!

بی بی جی : آجاؤ زینت!

غفوراں : اب آبھی جاؤ۔ ہائے شرماتی ہے۔

(زینت آتی ہے۔ پچیس چھبیس برس کی عورت۔ گہرے اور تیکھے نقش، رنگ سانولا جو ایک خاص قسم کی دلکشی لیے ہوئے ہے۔ لباس، دوپٹہ قمیص اور شلوار — زینت جھجکتے ہوئے اندر آتی ہے اور ایک طرف سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی ہے)

بی بی جی : بیٹھ جاؤ زینت (ہمدانی کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہیں ماسٹر ہمدانی بڑے عالم فاضل آدمی ہیں۔ کچھ پڑھنا چاہو تو بڑے شوق سے تمھیں پڑھا دیں گے!

(زینت ذرا مُسکراتی ہے مگر سر نہیں اُٹھاتی — ہمدانی بڑے غور سے زینت کو دیکھتا ہے)

ہمدانی: ان کا نام کیا ہے؟

بی بی جی: (مسکرا کر) تمھارا نام کیا ہے زینت۔

زینت: جی — زینت۔

بی بی جی: سُن لیا ہمدانی صاحب۔

ہمدانی: بڑا اچھا نام ہے۔

بی بی جی: صرف نام ہی اچھا نہیں۔ خود بھی بڑی اچھی عورت ہے۔ بیچاری بدقسمت ہے (آہ بھر کر) دُنیا میں کوئی بے سہارا نہ رہ جائے — تو زینت!

زینت: جی۔

بی بی جی: ان حضرت کے کمرے کی صفائی وغیرہ کا خیال تم رکھنا۔ فلسفی قسم کے آدمی ہیں۔ اپنے خیالوں ہی میں ڈوبے رہتے ہیں ہر وقت۔ سمجھ لیا نا۔

ہمدانی: انھیں تکلیف کیوں دیتی ہیں آپ؟

(ہمدانی کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے مگر بی بی جی کی گرم نگاہیں دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ غفوراں مُنہ میں کپڑا ٹھونسے ہنسی ضبط کر رہی ہے — زینت باوقار انداز میں کھڑی ہے۔ غفوراں کمرے سے نکل جاتی ہے)

بی بی جی : زینت! ہمارے ماسٹر ہمدانی کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے۔

زینت : بہتر (غفوراں آتی ہے)

غفوراں : صاب جی آگئے ہیں۔

بی بی جی : اچھا۔ (زینت جانے لگتی ہے۔ اور دروازے میں سے نکل جاتی ہے)

کیوں ہمدانی! اب کہو۔

ہمدانی : کیا کہا؟

بی بی جی : مراقبے میں ہو گیا؟ ابھی کیا دیکھا ہے تم نے!

ہمدانی : جو دکھایا ہے تم نے!

بی بی جی : ہے نا ہزاروں میں انتخاب۔

ہمدانی : سچ ہی کہتی ہو۔ (آہ بھرتا ہے)

بی بی جی : ہمدانی! مجھے تمھاری یہ بات بالکل پسند نہیں۔ ہر معاملے میں اپنے آپ کو حقیر سمجھتے ہو۔ حالانکہ بہت کچھ ہو ماشاء اللہ (احمد رضا آتا ہے اعلیٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس۔ عمر تیس کے لگ بھگ۔ صحت بڑی اچھی، اونچا لمبا جوان ۔۔) آئیے رضا صاحب! ان سے ملیے۔ یہ میرے عزیز ہیں ماسٹر ہمدانی۔ بڑے عالم فاضل آدمی ہیں۔

(احمد رضا ہمدانی کی طرف جاتا ہے۔ ہمدانی کھڑے ہو کر مصافحہ کرتا ہے)

احمد رضا : بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

ہمدانی: SO GLAD TOSEEYOU -

احمد رضا: (ہمدانی کے سامنے کرسی پہ بیٹھ کر بی بی جی سے) کیسے آپ کے ہارٹ کی تکلیف کا کیا عالم رہا۔

بی بی جی: ڈاکٹر نذیر کی دوا سے کافی فائدہ ہے۔

احمد رضا: اچھا (سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے) بہت اچھا۔

(ہمدانی جانے کے لیئے اٹھتا ہے)

بی بی جی: چلے ہمدانی!

ہمدانی: ہاں!

بی بی جی: تمہارا کمرہ غسل خانے کے ساتھ ہے۔

ہمدانی: بہتر (احمد رضا سے) اچھا صاحب! اب تو آپ سے ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں گی۔

احمد رضا: کیوں نہیں؟

(ہمدانی کمرے سے نکل جاتا ہے)

بی بی جی: وہاں کی سنائیے!۔ دیکھا کتنی بڑی جائداد ہے مگر انتظام کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ خوب لوٹا ہے لوگوں نے مجھے!

احمد رضا: جی ہاں ـــ اب تو بندوبست ہو جائے گا۔

بی بی جی: میرا پہلا منشی کہتا تھا اگر جائداد کا مناسب انتظام ہو جائے تو ڈیڑھ

دو ہزار کی ماہوار آمدنی معمولی بات ہے۔

احمد رضا: دُرست فرمایا آپ نے۔ یہاں کی سنائیے۔

بی بی جی: ہمارے گھر میں ایک نئی عورت آئی ہے — بچاری بڑی بدقسمت ہے۔ شوہر مر چکا ہے۔ یہاں سہارا ڈھونڈنے آئی تھی — اپنے ہمدانی کے ساتھ اُس کا پلّو بندھ جائے گا۔

احمد رضا: اور کوئی خبر؟

بی بی جی: اور تو کوئی خبر نہیں —— ہاں یاد آیا کوئی آدمی آپ کو پُوچھنے آیا تھا۔

احمد رضا: مجھے ...؟ کون تھا وہ؟

بی بی جی: میں نے تو دیکھا نہیں۔ کوئی ہوگا۔ میرا خیال ہے ہماری بازار والی حویلی کے لیے نیا کرایہ دار ہوگا۔ حویلی خالی ہونے والی ہے ناں۔

احمد رضا: غفوراں نے دیکھا تھا؟

بی بی جی: وہی ہوگا۔ اچھا اب سنئے! (احمد رضا دروازے کی طرف جانے لگتا ہے مگر بی بی جی کے الفاظ سُن کر ٹھہر جاتا ہے) ادھر آئیے!

احمد رضا: (قریب آ کر) کہئے!

بی بی جی: اس جمعہ کو اللہ رسول کا حکم پُورا کر دیں گے — ہمدانی کا نکاح بھی اُسی دن ہو جائے گا۔

(احمد رضا کوئی جواب نہیں دیتا۔ سر کھجلا رہا ہے۔ اسی عالم میں پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

(ایک سادہ کمرہ۔ فرش پر دری۔ سامنے کی دیوار پہ ایک رنگین کیلنڈر، مغربی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ جس کے بستر کو ایک اُجلی چادر سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک چھوٹی میز کے ارد گرد دو کرسیاں ــــ ان سے کچھ دُور ایک آرام کرسی۔ دروازہ مشرقی دیوار میں۔ ایک پٹ کھلا ہُوا۔ اس وقت دن کے چار بجے ہیں۔ ہمدانی کمرے میں آتا ہے ــــ پلنگ کی طرف بڑھتا ہے اور پھر پلنگ کے پاس پہنچ کر ایک دو لمحے رُک کر لوٹ آتا ہے اور میز کے سامنے کی کرسی پہ بیٹھ جاتا ہے۔ بی بی جی آتی ہیں ــــ اس وقت اُنھوں نے گہرے سُرخ رنگ کا جوڑا پہن رکھا ہے چہرہ پوڈر میں ڈوبا ہوا ہے۔ لپ سٹک ہونٹوں پر نمایاں ہے ــــ بی بی جی کو دیکھ کر ہمدانی اٹھ بیٹھتا ہے اور ان کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے جیسے ان کی آرائش و زیبائش پر داد دے رہا ہو ــــ بی بی جی یہ بات سمجھ کر مسکراتی ہیں۔)

ہمدانی: تو یہ ٹھاٹھ ہیں حضور کے۔

بی بی جی: ٹھاٹھ کیا ہوں گے۔ معمولی کپڑے پہن رکھے ہیں۔
ہمدانی: ماشاء اللہ۔ چشمِ بد دُور۔
بی بی جی: تم اپنی کہو۔ معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے نا۔
ہمدانی: مجھے تو خواہ مخواہ کانٹوں میں گھسیٹ رہی ہو (نفی میں سر ہلاتے ہوئے)
اُونہوں۔
بی بی جی: بنتے کیوں ہو؟
ہمدانی: بھئی اس میں بننے کی کیا بات ہے۔ اس کا رُخ تو ایں جانب کی
طرف ہے ہی نہیں۔
بی بی جی: جمعہ کو تمھارا نکاح ہو رہا ہے اور تم کہتے ہو اس کا رُخ۔
ہمدانی: اس دن دُلھن تو تم بنو گی۔ ہمارا کیا ہے بی بی!
بی بی جی: زینت بھی دُلھن بنے گی۔ سمجھے؟ ـــ (ہمدانی نفی میں سر ہلاتا ہے)
یہ قصہ کیا ہے آخر؟
ہمدانی: مجھے تو وہ بھائی جان کہتی ہے۔
بی بی جی: (بیزاری سے ماتھے پر ہاتھ مار کر) ہائے میرے اللہ۔ نرے بُدھو ہو۔ ارے
بھلے مانس عورت پہلے بھائی جان کہتی ہے۔ پھر بھائی۔ اور پھر صرف جان۔
(بی بی جی ہمدانی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی ہے۔ ہمدانی مُسکرانے لگتا ہے)
ہمدانی: سچ مُچ؟

بی بی جی : تو کیا میں جھوٹ بولوں گی — یہ بتاؤ وہ مسکرا کر بات کرتی ہے ناں تم سے ؟

ہمدانی : ہاں

بی بی جی : اور کیا چاہتے ہو — کسی اور سے تو بولتی ہی نہیں — مگر تم سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی ہے - اور بھی ثبوت چاہیے کوئی !

ہمدانی : میرے بستر پر چادر بھی اُسی نے بچھائی ہے شاید -

بی بی جی : یقیناً اُسی نے بچھائی ہے (بستر کو دیکھتی ہے) تمھارے کمرے کا انتظام اُسی کے سپرد ہے ناں (بی بی جی دروازے کی طرف جانے لگتی ہیں — پھر رُک جاتی ہیں) ابھی چائے بھجواتی ہوں اُس کے ہاتھوں - میں نے تمھارا ذکر کر دیا تھا اس سے - نکاح کی تاریخ بھی بتا دی تھی - تم بھی ذکر کر دینا - ہیں -

(ہمدانی اثبات میں سر ہلاتا ہے — بی بی جی کمرے سے نکل جاتی ہیں ہمدانی آہستہ آہستہ کیلنڈر کے پاس آ کر رُک جاتا ہے — جیب سے قلم نکال کر کیلنڈر کے کسی ہندسے پر کوئی نشان لگا دیتا ہے - پھر قلم جیب میں رکھ لیتا ہے — ایک دو لمحے ہندسے کو دیکھتا رہتا ہے — اسی طرح سر ہلاتا ہے جیسے کسی شاندار تجویز پر صاد کر رہا ہے - وہ ابھی کیلنڈر کے پاس ہی کھڑا ہے کہ زینت ٹرے میں چائے اور مٹھائی لے کر آتی ہے

ہمدانی اُس کی آمد سے بے خبر ہے۔ زینت سامان تپائی پر رکھتی ہے تو کھنک پیدا ہوتی ہے۔ ہمدانی مُڑ کر دیکھتا ہے۔ تپائی کی طرف قدم اٹھانے لگتا ہے۔ زینت چُپ چاپ سر جھکائے جانے لگتی ہے)

ہمدانی : جی زینت بیگم۔ صاحبہ!

زینت : جی!

ہمدانی : ذرا آئیے تو! ۔ ذرا بیٹھئے تو۔ ایک منٹ۔

زینت : (بدستور کھڑی ہے) فرمائیے۔

ہمدانی : بیٹھ جائیے۔ مجھے چائے بنا کر دیجیے ناں! (زینت کھڑی رہتی ہے اور چائے بنانے لگتی ہے۔ ہمدانی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے) بیٹھ جائیے ناں (زینت بیٹھ جاتی ہے) دو پیالیاں بنائیے! مجھے آپ کی یہ عادت بڑی پسند ہے کہ آپ بالکل الگ تھلگ رہتی ہیں۔

زینت : اس کی وجہ بی بی جی کو بتا چکی ہوں

ہمدانی : مجھے معلوم ہے۔ الگ تھلگ رہنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے آپ نے دیکھا میں بھی کچھ اسی طرح زندگی بسر کرتا ہوں۔ میل جول پسند نہیں کرتا۔ اس کی ایک وجہ ہے (زینت پیالی بنا کر ہمدانی کے سامنے رکھ دیتی ہے) دوسری پیالی بنائیے ناں!

زینت : آپ لیجیے۔

ہمدانی: اوہ آپ ایک ہی پیالی لائی ہیں۔ یہ غضب کیا ہے (غفوراں خالی پیالی پرچ اٹھائے آتی ہے اور پیالی رکھ کر جلدی سے چلی جاتی ہے) لیجیے اب تو بنائیے ناں (زینت دوسری پیالی بنانے لگتی ہے)

زینت: اس کی کیا وجہ ہے؟

ہمدانی: میرے الگ تھلگ رہنے کی؟ بتاتا ہوں۔

(ہمدانی اور زینت دونوں پیالیوں کو ہونٹوں سے لگا لیتے ہیں)

زینت: جی۔

ہمدانی: ایک واقعہ ہے — آپ کو سناؤں تو کوئی حرج نہیں ہے ناں؟

زینت: حرج کیا ہوگا! (مسکراتی ہے)

ہمدانی: آج سے تیرہ چودہ برس پہلے کا واقعہ ہے۔ میری ایک عزیزہ تھی — جو بڑی اچھی تھی — اُس زمانے میں دردِ سر کا مریض تھا — اب بھی کبھی کبھی سر میں درد ہوتا ہے تو تڑپ جاتا ہوں۔ بے پناہ درد ہوتا ہے تو میں کہہ رہا تھا میری یہ عزیزہ جس کا نام عائشہ تھا بہت اچھی تھی — یہی لڑکی میرے دردِ سر کا علاج کیا کرتی تھی؟ — کرتی یہ تھی، دیکھیے مسکرائیے نہیں — علاج اُس نے یہی سوچا تھا — وہ اسفنج میں عموماً ٹھنڈا پانی بھر کر آہستہ آہستہ میرے سر پہ پھیرتی تھی۔

زینت: (ہنسی روک کر) آپ تو بھیگ جاتے ہوں گے!

ہمدانی: لیکن بڑا مزا آتا تھا۔ چہرے پر پانی کی بوندیں گرتی تھیں تو بڑا لطف آتا تھا۔

زینت: یہ اسپنج کا کارنامہ نہیں۔ عائشہ کی انگلیوں کی برکت ہوگی۔

ہمدانی: دُرست ہے یہ بھی — افسوس عائشہ بیمار پڑ کر مرگئی۔ اس کے بعد میں تنہا رہ گیا — اس بھری دُنیا میں — بالکل اکیلا (آواز میں گہرا تاثر) یُوں زندگی گزارنے لگا جیسے جنگل میں ہوں۔

(دو تین لمحوں کے لیے خاموشی۔ ہمدانی چائے پیتا رہتا ہے۔۔ زینت اس کے سامنے مٹھائی کی پلیٹ رکھتی ہے — ہمدانی نہیں لیتا — زینت پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دیتی ہے۔ ہمدانی ابھی تک چائے آہستہ آہستہ پی رہا ہے — یکایک اس کی نظر کیلنڈر پر پڑتی ہے — اٹھتا ہے اور کیلنڈر کے پاس جا کر ٹھہر جاتا ہے)

ذرا ادھر آئیے۔

زینت: (وہاں جا کر) کہیے۔

ہمدانی: (کیلنڈر کے نشان والے ہندسے پر انگلی رکھ کر) یہ دیکھیے۔ میں نے دس کے ہندسے پر نشان لگا دیا ہے۔ معلوم ہے اس دن کیا ہوگا؟

زینت: ڈراما۔

ہمدانی: ڈراما —؟ ہاں — واقعی — میری خاموش زندگی میں ایک ڈراما

پیدا ہوگا — (زینت کی طرف مسکرا کر دیکھتا ہے) آپ نے بالکل درست فرمایا ہے۔ بالکل درست فرمایا ہے۔ ماشاءاللہ بڑی ذہین ہیں ماشاءاللہ۔

(زینت ٹرے اٹھا کر کمرے سے جانے لگتی ہے — پردہ)

تیسرا منظر

(اس منظر میں زینت کا کمرہ دکھایا جائے گا۔ پردہ اُٹھنے سے پیشتر ہی سازوں کے ریکارڈ کی جھنکار اور بھرپور قہقہوں کی آواز اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ آج بی بی جی کے گھر میں ہنگامہ مسرت برپا ہے جب پردہ اُٹھتا ہے تو زینت اپنے سادہ کمرے میں پلنگ کے اوپر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے — کمرے میں پلنگ کے سوا اور کوئی سامان نہیں ہے۔ دروازہ مشرقی دیوار میں ہے۔ مغربی دیوار میں ایک الماری ہے۔ زینت اسی لباس میں ملبوس ہے جس میں ہم اسے دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس وقت دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے — غفوراں آتی ہے)

غفوراں: واہ وا کیا شان بنا رکھی ہے۔ نکاح کے دن۔

زینت: شان کیسی؟

غفوراں: ذرا جا کر بیب جی کو تو دیکھو۔ ایسا سنگار کیا ہے کہ کسی کنواری نواب زادی نے بھی کیا کیا ہوگا۔

زینت : وہ ٹھہریں بی بی جی۔

غفوراں : اللہ رکھے جوان ہو — مرادوں کے دن ہیں۔

زینت : معاملہ پہنچا کہاں تک ہے!؟

غفوراں : بیب جی بالکل تیار ہو کر بیٹھی ہیں۔ تمھیں حکم ملا ہے کہ نیا جوڑا پہن کر اُدھر آجاؤ۔

زینت : اُدھر تو میں جاؤں گی نہیں۔ میلا لگا ہے بی بی جی کے پاس۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔

غفوراں : ہائے شرم کیسی۔ لوگوں کے نکاح نہیں ہوتے کیا؟

زینت : جب وہ قصّہ ہو جائے گا تو اُدھر چلی جاؤں گی۔

غفوراں : قصّہ کیسا؟

زینت : مولوی جی آئیں گے یا نہیں — تم نکاح پڑھا دو گی کیا؟

غفوراں : مولوی کو آدمی بُلانے گیا ہُوا ہے۔ دُلھن تو بنی نہیں ہو ابھی نکاح کیا ہو گا تمھارا۔ ویسی کی ویسی چڑیل بنی بیٹھی ہو۔ بی بی نے کل شام تمھیں نیا جوڑا نہیں دیا تھا؟

زینت : الماری میں ہے پہن لوں گی ابھی — پھر مولوی جی کے جانے کے بعد اُدھر آجاؤں گی۔ سمجھ لیا نا۔

غفوراں : اچھا تمھاری مرضی — بیب جی سے کہہ دیتی ہوں (اس اثنا میں ریکارڈ

بجتا رہا ہے ۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر قہقہے بھی سنائی دیتے رہے ہیں مگر اب یہ ہنگامہ یک لخت ختم ہو گیا ہے) لو آ گیا مولوی ۔ جلدی سے لباس بدل ڈالو ۔

زینت : بالکل فکر نہ کرو ۔ ابھی دروازہ بند کر کے لباس بدل ڈالتی ہوں ۔

غفوراں : جلدی کرو ۔ پہلے مولوی ادھر آئے گا پھر اُدھر جائے گا ۔

زینت : جانتی ہوں بابا ! اب بھاگو یہاں سے ۔

(غفوراں تیزی سے نکل جاتی ہے ۔ زینت دروازہ بند کر کے الماری کے پاس جاتی ہے ۔ الماری کھولتی نہیں ۔ دو تین لمحے وہاں ٹھہر کر واپس آ جاتی ہے ۔ دروازے پر آتی ہے ۔ آہستہ سے دروازے کا ایک پٹ کھول دیتی ہے ۔ باہر دیکھتی ہے اور پھر پلنگ پر آ کر اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ دیوار کی طرف اس کا منہ ہے ۔ غفوراں آتی ہے)

غفوراں : مولوی آ رہا ہے اور تم ۔ ویسی کی ویسی ۔

ہمدانی : فکر نہ کرو ۔ یونہی نکاح ہو جائے گا تو کیا حرج ہے ۔ لباس بدل ڈالوں گی مولوی جی کے جانے پر ۔

(غفوراں پیشانی پر ہاتھ مار کر چلی جاتی ہے ۔ زینت پلنگ پر بیٹھی ہے ۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آتا ۔ غفوراں دوبارہ آتی ہے ۔ اور اس کے پیچھے مولوی جی کمرے میں آتے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ دروازے کے باہر لوگ

زینت : وہ ٹھہریں بی بی جی۔

غفوراں : اللہ رکھے جوان ہو۔ مرادوں کے دن ہیں۔

زینت : معاملہ پہنچا کہاں تک ہے!؟

غفوراں : بیب جی بالکل تیار ہو کر بیٹھی ہیں۔ تمھیں حکم ملا ہے کہ نیا جوڑا پہن کر اُدھر آجاؤ۔

زینت : اُدھر تو میں جاؤں گی نہیں۔ میلا لگا ہے بی بی جی کے پاس۔ مجھے بڑی شرم آتی ہے۔

غفوراں : ہائے شرم کیسی۔ لوگوں کے نکاح نہیں ہوتے کیا؟

زینت : جب وہ قصّہ ہو جائے گا تو اُدھر چلی جاؤں گی۔

غفوراں : قصّہ کیسا؟

زینت : مولوی جی آئیں گے یا نہیں ۔ تم نکاح پڑھا دو گی کیا؟

غفوراں : مولوی کو آدمی بُلانے گیا ہوا ہے۔ دلھن تو بنی نہیں ہو ابھی نکاح کیا ہو گا تمھارا۔ ویسی کی ویسی چڑیل بنی بیٹھی ہو۔ بی بی نے کل شام تمھیں نیا جوڑا نہیں دیا تھا؟

زینت : الماری میں ہے پہن لوں گی ابھی ۔ پھر مولوی جی کے جانے کے بعد اُدھر آجاؤں گی۔ سمجھ لیا نا۔

غفوراں : اچھا تمھاری مرضی ۔ بیب جی سے کہہ دیتی ہوں (اس اثنا میں ریکارڈ

بجتا رہا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے پر قہقہے بھی سُنائی دیتے رہے ہیں
مگر اب یہ ہنگامہ یک لخت ختم ہو گیا ہے) لو آ گیا مولوی — جلدی سے
لباس بدل ڈالو۔

زینت: بالکل فکر نہ کرو — ابھی دروازہ بند کر کے لباس بدل ڈالتی ہوں۔

غفوراں: جلدی کرو۔ پہلے مولوی ادھر آئے گا پھر اُدھر جائے گا۔

زینت: جانتی ہوں بابا! اب بھاگو یہاں سے۔

(غفوراں تیزی سے نکل جاتی ہے — زینت دروازہ بند کر کے الماری کے
پاس جاتی ہے۔ الماری کھولتی نہیں — دو تین لمحے وہاں ٹھہر کر واپس
آجاتی ہے — دروازے پر آتی ہے۔ آہستہ سے دروازے کا ایک
پٹ کھول دیتی ہے — باہر دیکھتی ہے اور پھر پلنگ پر آکر اس طرح بیٹھ جاتی
ہے کہ دیوار کی طرف اس کا منہ ہے — غفوراں آتی ہے)

غفوراں: مولوی آرہا ہے اور تم — ویسی کی ویسی۔

ہمدانی: فکر نہ کرو۔ یُونہی نکاح ہو جائے گا تو کیا حرج ہے — لباس بدل
ڈالوں گی مولوی جی کے جانے پر۔

(غفوراں پیشانی پر ہاتھ مار کر چلی جاتی ہے۔ زینت پلنگ پر بیٹھی ہے —
اس کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ غفوراں دوبارہ آتی ہے — اور اس کے پیچھے
مولوی جی کمرے میں آتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ دروازے کے باہر لوگ

آ موجود ہوئے ہیں۔ مولوی جی ویسے ہی ہیں جیسے انھیں ہونا چاہیے۔ لمبی داڑھی، شرعی لباس —— وہ پلنگ کے پاس آکر رُک جاتے ہیں)

غفوراں : زینت! مولوی جی آئے ہیں۔

مولوی جی : تمھارا نام زینت ہے؟

زینت : جی!

مولوی جی : تمھیں نیاز ہمدانی ولد صمد خاں بعوض ایک ہزار حق مہر منظور ہے؟

زینت : مولوی جی آپ نے نام غلط لیا ہے —— ان کا نام احمد رضا ولد محمد رضا ہے۔

مولوی جی : کیا؟

غفوراں : (چھاتی پر ہاتھ مارتے ہوئے) ہائے خائے

زینت : احمد رضا ولد محمد رضا کہیے!

غفوراں : (منہ اس کے پاس لے جاکر) پاگل ہوگئی ہو زینت! تمھارے والا نیاز ہمدانی ہے —— وہ احمد رضا بیب جی والا ہے۔

زینت : مولوی جی میں بالکل دُرست کہہ رہی ہوں —— میرا کسی نیاز ہمدانی سے نکاح نہیں ہو سکتا۔

مولوی جی : (غفوراں سے) یہ تماشا کیا ہے؟

(دو مرد اور دو عورتیں کمرے میں آجاتی ہیں)

زینت : آپ، احمد رضا سے پوچھ لیجیے!

(غفوراں سینے پر دو ہتڑ مار کر ادہائی کہہ کر کمرے سے نکل جاتی ہے۔ مولوی جی حیران کھڑے ہیں دو مرد اور عورتیں حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔ — باہر بلند آوازیں اُبھرتی ہیں مگر کیا کہہ رہی ہیں یہ معلوم نہیں ہوتا — بی بی جی آتی ہیں — حیران اور سراسیمہ — ہانپتی ہوئی — لباس نہایت فاخرہ — چہرہ پوڈر میں غرق — ان کے ساتھ غفوراں بھی آتی ہے۔ ان کے پیچھے احمد رضا اور ہمدانی دولہا بنے ہوئے اندر آتے ہیں — زینت دوپٹے میں چہرہ چھپا لیتی ہے —)

مولوی جی : (بی بی جی سے) یہ تماشا کیا ہے — یہ کہتی ہے میرا نکاح احمد رضا سے ہے — کسی نیاز ہمدانی سے نہیں۔

(سب کے سب زینت کی طرف دیکھتے ہیں — زینت کا چہرہ چھپا ہوا ہے اب یک لخت وہ دوپٹہ ہٹا کر احمد رضا کی طرف دیکھتی ہے)

احمد رضا : رضیہ! —

(احمد رضا زینت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگتا ہے)

زینت : ذرا تماشا تو دیکھو رضا! میں تمہاری منکوحہ بیوی ہوں اور یہ لوگ کسی نیاز ہمدانی سے میرا پلو باندھ رہے ہیں۔

بی بی جی : دھوکا۔

(بی بی جی سینے پر دو ہتڑ مار کر گرنے لگتی ہیں۔ ہمدانی جو سر سے ٹوپی اتار کر اسے پنکھا بنا چکا ہے۔ بی بی جی کی طرف جلدی سے بڑھتا ہے۔ مولوی صاحب دروازے کی طرف مُنہ کر کے آواز دیتے ہیں" پانی لاؤ" ــــ غفوراں بھاگ کر کمرے سے نکل جاتی ہے ــــ باہر سے ہجوم کی آوازیں قریب آگئی ہیں ــــ اور پردہ جلدی سے گرتا ہے۔)

دوسرا باب

پہلا منظر

یہ منظر زینت (رضیہ) کے اپنے گھر میں وقوع پذیر ہوتا ہے ــــ ایک عام کمرہ۔ مختصر سا سامان۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ پلنگ، بستر تہ کر کے رکھا ہوا، بائیں دیوار کے ساتھ چند ٹرنک، ایک دوسرے کے اُوپر رکھے ہوئے۔ درمیان میں دو کرسیاں، صوفہ سٹ اور میز ــــ دائیں دیوار کے پاس کپڑا سینے کی مشین ــــ دروازہ بائیں دیوار میں ــــ جس وقت پردہ اُٹھتا ہے۔ زینت اور احمد رضا دروازے سے داخل ہو کر کمرے میں آرہے ہیں۔ احمد رضا کے چہرے کے اثرات پریشانی ظاہر کرتے ہیں اور زینت کی یہ حالت ہے جیسے" بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے"۔ دونوں کرسیوں کے پاس پہنچ جاتے ہیں ــــ زینت تیزی سے شوہر کی طرف

پلٹتی ہے اور اسے تیز تیز نظروں سے دیکھنے لگتی ہے ۔ احمد رضا اپنی
پیشانی پر ہاتھ پھیرنے لگتا ہے)

زینت : پہچانتے ہو اس گھر کو ۔ شاید اپنے کسی سپنے میں تم نے یہی گھر دیکھا تھا۔ اگر وہ سپنا بالکل فراموش نہیں ہو گیا تو تمھیں یاد آجائے گا کہ تمھارے ساتھ یہاں ایک عورت بھی رہتی تھی جسے تم اُس کے والدین کے گھر سے اپنا ننگ و ناموس سمجھ کر لائے تھے۔ جو تمہاری نوکرانی بھی تھی ۔ باورچن بھی، دھوبن بھی اور بیوی بھی۔

احمد رضا : رضیہ ہیں ۔

زینت : ذرا ٹھہرو ۔ ابھی وہ سپنا تمھیں پوری طرح یاد نہیں آیا۔ کچھ اور باتیں بھی یاد کراتی ہوں۔ اس عورت کی گود میں ایک بچّہ بھی تھا جو تمھاری اور اس کی محبت کا نتیجہ تھا۔ یہ بچہ دنیا سے چلا گیا ۔ شاید اس کے ننھے ننھے ہاتھوں کا لمس تمھیں بالکل بھولا نہیں ہو گا ۔ شاید اس کے لہو کی خوشبو اب بھی کبھی کبھی تمھاری یادوں میں تیر جاتی ہو گی۔

احمد رضا : مجھے یہ باتیں کیوں کر بھول سکتی ہیں ؟

زینت : سپنے کی باتیں بھول جاتی ہیں ۔ اس لیے میں تمھیں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ وہ عورت تمھارے ہر دکھ، ہر سکھ میں شریک ہونا اپنا فرض سمجھتی تھی ۔ تمھیں ذرا بھی پریشان دیکھتی تھی تو مضطرب ہو جاتی تھی ۔ شام کو

دروازے پر بار بار جاتی تھی کہ تم آؤ تو تمھیں چائے بنا کر پلائے ــــ اپنی باتوں سے تمھاری فکر دُور کرے ــــ تمھیں مایوس دیکھے تو زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے تمھاری ہمت بندھائے ــــ (احمد رضا اسے گھور گھور کر دیکھ رہا ہے) حیران ہو رہے ہو کہ میں کیا واہیات قصہ لے بیٹھی ہوں۔ کس منحوس زمانے کی باتیں کرنے لگی ہوں۔

احمد رضا : میں یہ نہیں سوچ رہا رضو!

زینت : رضو ــــ یہ نام تمھیں کیوں کر یاد آ گیا ــــ اپنے سپنے میں تم اس عورت کو پیار سے رضو کہہ کر ہی پکارتے تھے ــــ مگر حیرت ہے یہ نام تم بھول کیوں نہیں سکے؟

احمد رضا : آخر کب تک چرکے لگاتی رہوگی ــــ اب خاموش بھی ہو جاؤ رضو!

زینت : میں چرکے لگا رہی ہوں اور تم نے کیا کیا ہے ــــ شاید مجھ پہ پھولوں کی بارش برسائی ہے۔ واقعی یہ میرا قصور ہے جو پھولوں کو پتھر سمجھ بیٹھی ہوں ــــ کس قدر احسان فراموش ہوں۔ احسان ماننے کی بجائے طعنے دے رہی ہوں!

احمد رضا : اب چھوڑو یہ داستان ــــ مجھے افسوس ہے کہ ایسا ہو گیا ــــ یہ داستان بھول جانی چاہیے۔

زینت : داستان کا وہ حصہ تو سن لو جو سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے تم نے

لڑ جھگڑ کر مجھے میکے میں بھجوا دیا اور سمجھ لیا کہ مجھ سے نجات حاصل کر لی ہے ــــ اتفاقاً ایک دن جمیل صاحب کے ہاں پہنچ گئی۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ تم دونوں نے ایک دولت مند بے اولاد بیوہ کے نکاح ثانی کا اشتہار پڑھا تھا اور تم نے کہا تھا ــ اگر اس بیوہ سے نکاح کر لیا جائے تو اس کی ساری جائداد ہاتھ آسکتی ہے ــــ بوڑھی تو ہو گئی ہے ــ کچھ مدّت بعد مر جائے گی۔" اس وقت یہ مذاق تھا لیکن تمھارے ذہن میں ایک شیطانی منصوبہ پرورش پانے لگا تھا! (احمد رضا پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہا ہے) اور تم غائب ہو گئے! جب میں جمیل کے ہاں گئی تو کئی دن سے تم ان کے ہاں نہیں گئے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے جمیل صاحب کو اس بیوہ کے یہاں بھیج دیا ــ معلوم ہوا کہ تم اس کی جائداد کا انتظام کرنے منٹگمری گئے ہوئے ہو ــ میں نے جمیل کو بالکل خاموش رہنے کی تاکید کر دی اور خود وہاں پہنچ گئی ــــ حالات نے مجھے ایک دلچسپ ڈرامے کا کردار بنا دیا تم نے سوچا تھا ــ نکاح تو ہو جانے دو ــ بعد میں کیا ہو سکتا ہے ــ رو دھو کر چپ ہو جائے گی ــــ مرد اسی طرح سوچا کرتے ہیں! (احمد رضا سر جھکائے کھڑا ہے) ایک ڈاکو جب کسی غیر کے گھر ڈاکہ ڈالتا ہے تو صرف اس لیے کہ اپنا گھر بھر لے مگر تم نے بیک وقت دو گھروں پہ ڈاکہ ڈالا۔ غیر کے گھر پہ بھی اور اپنے گھر پہ بھی

کسی چور یا ڈاکو نے آج تک ایسا کیا بھی ہے۔ بتاؤ۔ سوچ کیا رہے ہو — ضمیر کے آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔ دیکھو تمھیں کیسی بھیانک اور مکروہ شکل نظر آتی ہے — یہ کس کی شکل ہے۔ بتاؤ — بتاؤ مجھے!

احمد رضا : رضو! تم جانتی ہو — میں نے اچھی ملازمت کے لیے کتنی کوشش کی — مگر ایسی ملازمت کہیں بھی نہیں ملی جس سے باعزت طور پر زندگی بسر ہو سکے۔

زینت : اس لیے تم نے اپنی ناکامی کا انتقام مجھ سے لینا چاہا — اس بیوہ عورت سے لینا چاہا اور دونوں گھر برباد کرنے کی ٹھان لی!

احمد رضا : مجھے اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔

زینت : اس عورت سے شادی کر لیتے پھر اس کی موت کا انتظار کرتے۔ کیا انسانیت ہے۔ سبحان اللہ۔ دو گھر برباد کر کے لطف اٹھانا چاہتے تھے — نتیجہ کیا ہوگا — یہ تم نے کیوں سوچا ہوگا!

(زینت اسے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے — اس کی آنکھیں نمناک ہیں۔ احمد رضا چُپ چاپ کھڑا ہے۔ زینت دروازے کی طرف جانے لگتی ہے)

احمد رضا : رضو! — رضو!! سُنو تو — دیکھ رضو!

زینت : اب کیا کہنا چاہتے ہو — کہنے کے لیے اب کیا باقی رہ گیا ہے — میں کچھ بھی سُننا نہیں چاہتی — کچھ بھی نہیں سُنوں گی!!

(زینت تیزی کے ساتھ دروازے میں سے نکل جاتی ہے ۔ احمد رضا اس کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہے ۔ پھر دروازے کی طرف جانے لگتا ہے — اور پردہ گرتا ہے)

دُوسرا منظر

(بی بی جی کا کمرہ — بی بی جی پلنگ پر بیٹھی ہیں ۔ نڈھال اور مضمحل ۔ رحیماں برف والے برتن میں پٹی بھگو کر غفوراں کو دیتی ہے ۔ غفوراں یہ پٹی بی بی جی کی پیشانی پر لگاتی ہے ۔ رحیماں دوسری پٹی تیار کرنے لگتی ہے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بی بی جی کے مُنہ سے ہائے ہائے نکل جاتی ہے ۔ پلنگ سے کچھ دُور آرام کرسی میں ہمدانی دھنسا ہوا ہے ۔ ٹوپی ہاتھ میں پکڑ رکھی ہے اور دایاں ہاتھ سر پر رکھا ہوا ہے اس انداز سے جیسے سر میں شدید درد ہے — آنکھیں بند ہیں — پردہ اُٹھنے کے بعد — دو تین لمحے بی بی جی کی ہائے ہائے کے سوا کوئی آواز بلند نہیں ہوتی — پھر ہمدانی آنکھیں کھولتا ہے اور بی بی جی کی طرف دیکھتا ہے)

ہمدانی : (کمزور آواز میں) غفوراں !

غفوراں : جی !

ہمدانی : ایمبولنیس آگئی (غفوراں خاموش رہتی ہے) تم لوگ سمجھتے ہی نہیں ہو —

بی بی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ انھیں ایمبولینس کار میں بٹھا کر ہسپتال لے جانا چاہیے۔

غفوراں : نادر دوائی لینے گیا ہوا ہے۔

ہمدانی : تم ڈاکٹر نذیر سے جا کر کہہ دو نا ۔ ٹیلی فون کر دیں گے۔ دیکھتی نہیں ہو بی بی کی کیا حالت ہے!

غفوراں : ماسٹر جی! یہ نام میری زبان پر چڑھتا ہی نہیں۔

ہمدانی : کہو ایم۔ بُو۔ لینس۔ کہو نا۔ ایم۔ ہجے کر لو نا بابا! کہو اے۔ م

غفوراں : اے۔ م

ہمدانی : بُو۔ ب پیش بو۔

غفوراں : بُو۔

ہمدانی : لینس ۔ ایم، بو، لینس۔

غفوراں : اے ۔م ۔ آگے کیا ہے؟

ہمدانی : جلدی سے کہو نا ۔ ایمبولینس ۔ ایمبولینس۔

بی بی جی : (بیزاری سے) چُپ کر ۔ ماسٹر کے بچے۔

(غفوراں اور رحیمن مُنہ دوسری طرف پھیر لیتی ہیں)

ہمدانی : یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔

(دائیں دروازے پر زینت آتی ہے ۔ ایک دو لمحے وہاں ٹھہرتی ہے پھر

بھاگ کر اندر آتی ہے اور بے اختیار بی بی جی سے لپٹ کر رونے لگتی ہے
۔ بی بی اس حادثے پر حیران ہیں۔ ہمدانی، غفوراں اور رحیماں بھی حیران
ہیں۔ زینت زور زور سے رو رہی ہے)

زینت : بی بی جی — بی بی جی!! (بی بی جی گھبرا گئی ہیں) بی بی جی! میں لُٹ گئی
— تباہ ہو گئی — جیتے جی ہی مر گئی!

بی بی جی : کیا ہُوا؟

(زینت کو پرے ہٹانے لگتی ہے)

زینت : میں مر گئی بی بی جی!

بی بی جی : ہوا کیا؟

زینت : بی بی جی — اس دن میں انھیں لے گئی تھی ناں — گھر جا کر میں نے
— بڑا — شرمندہ کیا — میں نے کہا تم نے مجھے بھی دھوکا دیا۔ اور — اور
— فرشتہ خصلت بی بی کو بھی — میں نصیبوں جلی کیا جانتی تھی کہ — کہ —

(زینت پھر زور زور سے رونے لگتی ہے — سب حیرت میں گم سم کھڑے ہیں)

بی بی جی : بتاؤ تو۔

زینت : وہ — اتنے شرمندہ ہوئے کہ — خودکشی کر لی۔

بی بی جی : خودکشی؟

زینت : جی بی بی جی! — میں تو زندہ ہی قبر میں جا پڑی ہوں۔ ہائے اللہ میں نے

اُن سے ایسے سخت الفاظ کہے کیوں تھے ۔ میرے اللہ! بی بی جی!

بی بی جی: ہاں

زینت: میں آپ کے پاس ایک التجا لے کر آئی ہوں۔ مرحوم نے مرنے سے پہلے کہا تھا ۔ بی بی جی سے جا کر کہنا ۔ میری آنکھوں پہ پٹی بندھ گئی تھی ۔ میں اندھا ہو گیا تھا ۔ خدا کے لیے میرا قصور معاف کر دیں ۔ (زینت زور زور سے رونے لگتی ہے) بی بی جی آپ فرشتہ ہیں ۔ ان کا جرم معاف کر دیں ۔ تا کہ انھیں سکون مل سکے ۔ مرنے کے بعد آدمی کو سکون ملنا چاہیے بی بی جی! ۔ معاف کر دیجیے اللہ رحم کرے گا ۔ بی بی جی! خدا کے لیے معاف کر دیجیے ۔

بی بی جی: اللہ رحم کرے ۔

زینت: اللہ رحم کرے ہم سب پر ۔ اور مرحوم پر بھی ۔

(زینت پھر بی بی سے لپٹ کر رونے لگتی ہے اور پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے ۔ بی بی جی پلنگ پر گاؤ تکیے سے پشت لگائے پان بنا رہی ہیں ۔ ان کی حالت اب بہتر نظر آتی ہے ۔ غفوراں پانی کا گلاس لے کر آتی ہے ۔ بی بی جی پان بائیں ہاتھ میں رکھ کر دائیں ہاتھ سے گلاس پکڑ لیتی ہیں ۔ تین چار گھونٹ پی کر گلاس غفوراں کو واپس دے دیتی ہیں ۔ پاندان

تپائی پر پڑا ہے۔ بی بی جی اس میں سے تین چار الائچی کے دانے اٹھا کر پان میں ڈالتی ہیں اور پان منہ میں رکھ لیتی ہیں ۔ غفوراں جانے کے لیے مڑتی ہے ۔ بی بی جی اس کی طرف دیکھتی ہیں اور ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک لیتی ہیں)

بی بی جی : یہ ہمدانی کہاں ہے ؟

غفوراں : مجھے تو پتہ نہیں۔ ابھی ابھی زینت سے باتیں کر رہے تھے۔

بی بی جی : زینت کیا کر رہی ہے ؟

(زینت آتی ہے)

غفوراں : خود ہی آگئی ہے۔

(غفوراں چلی جاتی ہے)

بی بی جی : ہمدانی کی کچھ خبر

زینت : ڈاکٹر کے ہاں گئے ہیں۔

بی بی جی : وہ کیوں ؟ ڈاکٹر صبح خود جو آیا تھا۔

زینت : کہتے تھے ڈاکٹر سے پوچھ کر بی بی جی کے لیے پھل لاؤں گا۔

بی بی جی : وہمی آدمی ہے۔

زینت : ہر وقت آپ ہی کی فکر میں ڈوبے رہتے ہیں ۔ میں نے کہا بھی تھا پھل خرید کر لے آئیے ۔ کہنے لگے ۔ ڈاکٹر سے پوچھ کر لاؤں گا۔ وہیں گئے ہوئے ہیں۔

بی بی جی: کہا جو وہمی ہے۔

زینت: دل کے بڑے اچھے ہیں — اس زمانے میں مخلص آدمی ہیں کہاں

بی بی جی۔

بی بی جی: ہاں تو تُم نے کیا سوچا ہے اپنے بارے میں۔

زینت: میں نے کل شام ذکر کیا تھا نا کہ میرے ایک رشتے کے ماموں ہندستان سے یہاں آئے ہیں — کچھ دنوں کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے ہمیشہ کے لیے!

بی بی جی: یہاں نہیں رہو گی۔

زینت: نہیں بی بی جی! اب تو دُنیا سے جی بھر گیا ہے۔

بی بی جی: ہوں۔

زینت: آپ کے پاس صرف اس لیے آئی تھی کہ مرحوم کی آخری آرزو پوری ہو جائے۔ وہ پوری ہو گئی ہے (زینت دروازے کی طرف دیکھتی ہے) ہمدانی صاحب کو کچھ دیر ہی ہو گئی ہے — بیچارے خود بھی مریض ہیں۔

بی بی جی: ڈاکٹر کے پاس جو گیا ہے سر درد کی دوا بھی لے آئے گا۔

زینت: کچھ عجیب معاملہ ہے بی بی جی!

بی بی جی: کیا معاملہ ہے؟

زینت: ان کے مرض کا علاج بڑا عجیب ہے — صرف میں ہی جانتی ہوں اور کوئی نہیں جانتا۔

بی بی جی: صرف تم ہی جانتی ہو (زینت خاموش ہے۔ ہمدانی ہاتھ میں لفافے لیے ہوئے آتا ہے۔ بی بی جی ہمدانی کی طرف دیکھتی ہیں) یہ تمھیں کیا مصیبت پڑی تھی؟۔ کیا کچھ اٹھا لائے ہو؟

(ہمدانی زینت کی طرف دیکھتا ہے۔ زینت لفافے لے کر جلدی سے نکل جاتی ہے۔ پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

(بی بی جی کا وہی کمرہ ــ بی بی جی پلنگ پر بیٹھی ہیں۔ پاس کرسی پر ہمدانی نظر آرہا ہے۔ تپائی کے اوپر رومال سے ڈھکی ہوئی کوئی چیز پڑی ہے)

ہمدانی: بی بی! کیا بات ہے۔ مجھے اس طرح اپنے پاس کیوں بٹھا رکھا ہے؟

بی بی جی: تمھارے سر میں درد ہے ناں۔

ہمدانی: ہے تو۔

بی بی جی: میں سر درد کا علاج کرنا چاہتی ہوں!

(ہمدانی کرسی سے اٹھ بیٹھتا ہے)

ہمدانی: علاج کرنا چاہتی ہو ــ وہ کس طرح!

بی بی جی: ہائے تم بیٹھو تو ــ کتنے بے صبرے ہو۔ پوری بات بھی نہیں سنتے بیٹھو ــ (اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتی ہیں) بیٹھ بھی جاؤ بھئی!

(ہمدانی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

ہمدانی : علاج کس طرح ہو گا؟

بی بی جی : بس دیکھتے جاؤ - مریض کا علاج کس طرح کرنا چاہیے - یہ بات طبیب ہی جانتا ہے - ذرا کرسی قریب کھسکا لو۔

ہمدانی : کیا مصیبت ہے!

(ہمدانی کرسی قریب کھسکا کر بی بی جی کے قریب تر آجاتا ہے)

بی بی جی : رُخ دوسری طرف ہونا چاہیے اور پُشت میری طرف -

ہمدانی : یہ کیا ہوا بھلا!؟

بی بی جی : وقت ضائع مت کرو۔

ہمدانی : قہرِ درویش - بر جانِ درویش -

(ہمدانی کرسی کی پُشت پلنگ کے ساتھ لگا دیتا ہے --- پھر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

بی بی جی : شاباش - بڑے اچھے آدمی ہو - ذرا آنکھیں بند کر لو

ہمدانی : یہ بھی شرط ہے -

بی بی جی : علاج کا ایک حصّہ ہے یہ بھی۔

ہمدانی : اچھا - یہ بھی سہی۔

(ہمدانی آنکھیں بند کر لیتا ہے --- بی بی جی اس کے سر سے ٹوپی ہٹا دیتی ہیں۔

— پھر تپائی پر پڑی ہوئی چیز سے رومال الگ کرتی ہیں — ایک برتن دکھائی دیتا ہے جس میں برف پڑی ہے اور ساتھ ایک اسپنج بھی۔ بی بی جی اسپنج اٹھا کر ہمدانی کے گنجے سر پر رکھ دیتی ہیں۔ ہمدانی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے — اسپنج بی بی جی کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے)

ہمدانی : یہ کیا؟

بی بی جی : (ذرا غصے میں) بیٹھ جاؤ — یہ کیا بدتمیزی ہے۔

ہمدانی : پر دیکھو تو — یہ آخر ہوا کیا تمہیں — یہ کر کیا رہی ہو — تماشا کیا ہے آخر؟

بی بی جی : ایک منٹ کے لیے چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔

ہمدانی : چھوڑو یہ قصہ — علاج کرنے لگی ہے خیر سے۔

بی بی جی : میں کہتی ہوں بیٹھ جاؤ (غصے سے) بیٹھ جاؤ

(ہمدانی بیٹھ جاتا ہے — بی بی جی آہستہ آہستہ اس کے سر پر اسپنج پھیرتی ہیں)

کہو — اب کیا حال ہے۔

ہمدانی : کیا کہوں؟

بی بی جی : یہی کہ درد دور ہو رہا ہے ناں۔

(ہمدانی کوئی جواب نہیں دیتا)

ہمدانی! — ماسٹر ہمدانی — ہمدانی جی!!

ہمدانی: کہو۔

بی بی جی: درد دُور ہو رہا ہے ناں۔

ہمدانی: کچھ کچھ — یہ علاج تمھیں بتایا کس نے ہے؟

بی بی جی: الہام ہُوا ہے — الہام! سمجھے! (وقفہ — ہمدانی کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں) شاید تمھیں کچھ یاد آ رہا ہے — بیتے زمانے کی خوشگوار یادیں۔ شاید تمھارے دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا ہے۔

ہمدانی: ہوں۔

بی بی جی: کاش میری انگلیوں میں وہ نرمی — وہ ملائمت آ سکتی جو کسی کی انگلیوں میں تھی — پھر تمھیں آرام مل سکتا — سکون حاصل ہو جاتا!

ہمدانی: (جذباتی رَو میں) میرے لیے اس دُنیا میں کچھ بھی نہیں ہے — میرے حصّے میں صرف کانٹے ہی کانٹے ہیں — خوبصورت پھولوں سے میرا کیا واسطہ — خوشبوؤں اور نغموں سے میرا کیا تعلق۔ زندگی کی حسین چیزوں میں میرا کیا حصّہ؟ میں تو — میں تو (جذبات کی شدت میں کچھ کہہ نہیں سکتا)

بی بی جی: ایسا نہ کہو ہمدانی! تمھارا دل تو بہار کی صبح کی طرح شاداب ہے — تمھارے سینے میں سچا درد ہے — مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے اچھے آدمی ہو — میری تیمارداری تم نے اتنی ہمدردی سے کی ہے کہ — کہ — میں ہی جانتی ہوں۔

ہمدانی: میں اچھا آدمی ہوں؟

بی بی جی: ہاں — بہت اچھے آدمی ہو — کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی —
کاش میری انگلیوں میں وہی نرمی آجاتی!

ہمدانی: بی بی!

بی بی جی: ہاں — ہمدانی!

ہمدانی: تمہاری انگلیوں میں تو بڑی مٹھاس ہے۔ بڑا رس ہے۔ مجھ پہ تو نشہ سا
چھانے لگا ہے۔

بی بی جی: سچ؟

ہمدانی: بالکل سچ —!

بی بی جی: ہمدانی! — میں اب تک تمھیں پہچان کیوں نہ سکی؟

ہمدانی: اب پہچان لیا ہے کیا؟

بی بی جی: ہاں — ہمدانی! تم یہیں رہو — میرا سہارا بن جاؤ — کہیں بھی نہ جاؤ —
ہم دونوں بڑے سکون سے زندگی بسر کریں گے۔

ہمدانی: کیا میں ایسا خوش نصیب ہوں؟

بی بی جی: کیوں نہیں — میں اب تمھیں ہرگز جانے نہیں دوں گی۔

ہمدانی: میں نہیں جاؤں گا — کہیں نہیں جاؤں گا۔

بی بی جی: زندگی کی نئی صبح طلوع ہو گئی ہے۔

(زینت آتی ہے — بی بی جی کا ہاتھ ہمدانی کے سر سے الگ ہو جاتا ہے)

زینت: (مسکراتے ہوئے) مبارک ہو بی بی جی! زندگی کی نئی صبح۔

(احمد رضا بھی ہنستا ہوا آتا ہے)

احمد رضا: میں بھی مبارک باد دینے آگیا ہوں موت کی سرحد پار کر کے — بہت بہت مبارکبادیں۔

(بی بی جی اور ہمدانی سنّاٹے میں آجاتے ہیں)

بی بی جی: دھوکا۔

(ہمدانی ٹوپی کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے — اس کے ہاتھ میں اسپنج آجاتا ہے وہ اسپنج ہی کو ٹوپی سمجھ کر پنکھا بنا لیتا ہے — زینت اور احمد رضا ہنس رہے ہیں — اور تیزی سے پردہ گرتا ہے)

حویلی

افرادِ تمثیل

ارجمند بانو	شہزادہ صاحب کی بڑی بیٹی
ممتاز بانو	شہزادہ صاحب کی چھوٹی بیٹی
شہزادہ ابوجہانگیر مرزا اکبر بیگ	شہزادہ صاحب۔ حویلی کے مالک
جہانگیر	شہزادہ صاحب کا بیٹا
فیروز، نوازش اور رحمت	شہزادہ صاحب کے تین پرانے ملازم
بنک کا مینجر	

پہلا منظر

(حویلی کا ایک خاص کمرہ۔ عام کمروں سے زیادہ وسیع۔ چھت اُونچی اور دیواریں گو بوسیدہ ہیں لیکن ان پر پہلی نظر ڈالتے ہی ذہن میں عظمت کا ایک ایسا احساس پیدا ہو جاتا ہے جو عام طور پر شان دار پُرانی عمارتوں سے وابستہ ہے۔ سامنے کی دیوار پر، مینٹل پیس کے اوپر دو بڑی تصویریں جن کے چوڑے سنہری چوکھٹے ابھی تک جگمگا رہے ہیں۔ پہلی تصویر میں حویلی کے موجودہ مالک شہزادہ ابوجہانگیر مرزا اکبر بیگ کے والدِ گرامی جلوہ گر ہیں۔ ایک لحیم و شحیم بزرگ۔ داڑھی سیاہ۔ سر پر چوگوشیہ ٹوپی اور جسم قبا میں چھپا ہوا۔ دوسری تصویر شہزادہ صاحب کے دادا صاحب کی ہے۔ یہ بزرگ چوگوشیہ ٹوپی، ریشمی کرتہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے ایک سنہری کرسی میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مینٹل پیس پر ایک منقش گھڑی پڑی ہوئی — اس کے اوپر درمیان میں سنگِ مرمر کا بنا ہوا ایک بہت خوبصورت تاج محل اور اس کے ارد گرد چینی کے گلدان ہیں کاغذی پھول، مینٹل پیس کے سامنے ایک پلنگ۔ سفید چادر بچھی ہوئی، ریشمی تکیہ

کٹہرے سے لگا ہوا، پلنگ کے پاس ایک تپائی اور اس کے پاس ترتیب سے رکھی ہوئی تین پرانی طرز کی کرسیاں، دروازہ جنوبی دیوار میں جس پر ایک منقش پردہ پڑا ہے۔ کمرے میں جتنا فرنیچر نظر آتا ہے، سب کا سب شہزادہ صاحب کے باپ دادا کے وقت کا ہے۔ شہزادہ صاحب کی مالی حالت نے کبھی اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ پرانے فرنیچر میں کچھ اضافہ کر سکیں۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے — اور یہ وقت دن کا تیسرا پہر ہے — ارجمند بانو سوئی سے رومال کے ایک کونے میں کوئی پھول وغیرہ کاڑھتی ہوئی دروازے میں سے نکل کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی پلنگ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ارجمند بانو شہزادہ صاحب کی بڑی لڑکی ہے۔ عمر چھبیس ستائیس کے لگ بھگ، چہرے کے نقوش تیکھے۔ چھریرا بدن، معمولی قسم کے دوپٹے، قمیص اور پاجامے میں ملبوس، نگاہیں رومال پر جمی ہیں۔ پیشانی سے کوئی گہری سوچ نمایاں ہے، ابھی وہ پلنگ کے پاس ہی پہنچتی ہے کہ دروازے کے باہر سے اس کی چھوٹی بہن ممتاز بانو کی آواز آتی ہے "آپی" — ارجمند بانو رومال سے نظریں ہٹا کر دیکھتی ہے اور جواباً کہتی ہے "آؤ تازی"۔ تین چار لمحوں کے بعد ممتاز بانو آتی ہے۔ بہن کا سا ناک نقشہ: لباس بھی وہی، بہن سے تین چار سال چھوٹی ہوگی ممتاز بانو کو اندر آتے دیکھ کر ارجمند بانو آگے بڑھ کر ایک کرسی کے پاس رک جاتی ہے۔ ممتاز اس کے سامنے پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے)

ارجمند بانو: کیوں تازی!

ممتاز بانو: نہیں ہیں۔

ارجمند بانو: کتابوں والے کمرے میں دیکھا ہوتا۔

ممتاز بانو: حویلی کا ایک ایک کمرہ دیکھ آئی ہوں۔ ابھی باہر ہیں۔

ارجمند بانو: چار بج رہے ہیں اور آج تو اُنھوں نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟

ممتاز بانو: کیا کر رہے ہیں — آپ نہیں جانتیں آپی! اسی فکر میں سرگرداں ہیں۔ اس کے سوا اور کیا فکر ہو سکتی ہے اُنھیں!

ارجمند بانو: (آہ بھر کر) اِسی فکر میں تو انھیں نہ دن کا آرام سُوجھتا ہے نہ رات کی نیند۔

ممتاز بانو: یہی تو مصیبت ہے!

ارجمند بانو: میں نے صبح کہا تھا "ابّا حضور! ناشتہ دو منٹ میں تیار ہو جاتا ہے۔ ذرا توقف کر لیجیے۔" کہنے لگے "بھوک نہیں ہے اور دیکھو شاید جلدی نہ آسکوں۔ کھانے پر میرا انتظار نہ کرنا —"

ممتاز بانو: آپی! آپ کو معلوم ہے، معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر گیا ہے۔ بنک سے تین نوٹس آچکے ہیں "سارا روپیہ ادا کرو۔ ورنہ —"

ارجمند بانو: (جلدی سے) دوسری صورت اُن کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے

— (رومال پر نظر جما کر) ہو گا کیا آخر!

ممتاز بانو: جو ہونا ہے وہ تو ہو کر رہے گا۔

ارجمند بانو: (بہن کو گھورتے ہوئے) نہیں ایسا نہیں ہو گا تازی!

ممتاز بانو: تو آپی! ذرا مجھے بتایئے نا اور کیا صورت ممکن ہے۔

ارجمند بانو: اباجان دن رات کے چوبیس گھنٹے تگ و دو کر رہے ہیں کچھ نہ کچھ تو ہو گا ضرور۔

ممتاز بانو: آپی! اتنی بڑی رقم کا انتظام ہو جائے گا کیا؟ پینتالیس ہزار سے کم رقم نہیں ہے بنک والوں کی!

ارجمند بانو: کبھی بالکل معمولی رقم ہو گی، سُود در سُود کے چکر نے اتنی بڑی رقم بنادی ہے۔

ممتاز بانو: بنک والے تو بہر حال وہی رقم مانگیں گے جو واجب الادا ہے، انھیں اس سے کیا واسطہ کہ دادا جان مرحوم نے اُس وقت کتنی معمولی رقم پر حویلی رہن رکھی تھی۔ اب اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ حویلی بنک کے حوالے کر دی جائے — آخر بنک والے یہ چھوڑیں گے بھی کیوں؟ آپی!

ارجمند بانو: تازی! تم نے اباجان کے دل و دماغ کو ابھی سمجھا ہی نہیں۔ جو شخص اپنی حویلی کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھتا ہے اور جس شخص کی نظروں میں یہ عمارت خاندانی عظمت کی سب سے بڑی نشانی ہے وہ دنیا کی ہر چیز چھوڑ دے گا۔

حویلی کسی حال میں بھی نہیں چھوڑے گا۔ تمھیں خبر نہیں اس حویلی کو بچانے کے لیے اُنھوں نے اب تک کیا کیا ہے۔ کیسی کیسی کوشش کی ہے۔ کیسے کیسے طریقے اختیار کیے ہیں کہ اور سب کچھ چلا جائے حویلی سلامت رہے۔ پھر بھی تم ایسی بات کہتی ہو!

ممتاز بانو: میں سب کچھ جانتی ہوں آپی! ابا جان نے اس کے لیے جوا کھیلا ہے ریس میں شامل ہوئے ہیں۔ ڈربی کے ٹکٹ خریدے ہیں۔ دفتری ملازمت کے علاوہ گھر میں بیٹھ کر بھی کام کیا ہے مگر اپنی تمام کوششوں کے باوجود سُود کی رقم بھی ادا نہیں کر سکے۔

ارجمند بانو: سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ اُنھوں نے جو کچھ کیا ہے تنہا کیا ہے، بیٹے نے ساتھ نہیں دیا بلکہ اُلٹی مخالفت کی ہے۔

ممتاز بانو: اسی لیے اُنھوں نے بیٹے کو گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا تھا — اور اب ہم اس کی صورت کو بھی ترس گئی ہیں

ارجمند بانو: یہ بدقسمتی ہے ابا جان کی — لوگ کہتے ہیں بیٹا باپ کا عصا ہوتا ہے مگر یہاں بیٹا باپ کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔

ممتاز بانو: آپی! ذرا یہ بھی سوچیے آخر بیٹا کر ہی کیا سکتا ہے؟

ارجمند بانو: کم از کم باپ کا ساتھ ہی دیتا!

ممتاز بانو: وہ کہتا ہے حویلی کے لیے اپنی زندگی کو تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ عزت و آبرو

کی زندگی ہر جگہ بسر کی جا سکتی ہے۔ حویلی جاتی ہے تو جانے دیجیے۔ کسی اور مکان کا فوراً بندوبست ہو سکتا ہے۔ وہاں ہم اطمینان کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔

ارجمند بانو: ابا جان حویلی سے نہیں نکلیں گے۔ پرسوں انھوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ جب تک میں زندہ ہوں کسی اجنبی کا قدم یہاں نہیں آ سکتا۔

ممتاز بانو: تو وہ پینتالیس ہزار کا قرض کیوں کر ادا ہو سکے گا آپی!

(ارجمند بانو اس کے جواب میں بہن کو یاس انگیز نظروں سے دیکھتی ہے۔ زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالتی)

آپ اسے گستاخی سمجھیں گی لیکن میں یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اگر دادا جان نے بنک سے روپیہ قرض نہ لیا ہوتا تو یہ مصیبت ہم پر کبھی نازل نہ ہوتی۔ جہانگیر کہتا ہے دادا جان نے یہ روپیہ محض عیش و عشرت کے لیے لیا تھا۔

ارجمند بانو: جہانگیر نے تو تیرا دماغ بھی خراب کر دیا ہے۔ خدارا ایسی بات ابا جان کے سامنے نہ کہنا انھیں سخت صدمہ ہو گا۔

ممتاز بانو: کاش ابا جان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اب حویلی ہمارے پاس نہیں رہ سکتی۔ فضول کوشش نہ کریں اور اس عمر میں خواہ مخواہ پریشانی نہ اٹھائیں۔

(ارجمند بانو بہن کو گھور کر دیکھتی ہے اور پھر سر جھکا کر کاڑھنے میں مصروف

ہو جاتی ہے۔ ممتاز رخ پھیر کر تصویروں کو دیکھنے لگتی ہے۔ باہر سے شہزادہ صاحب کی آواز آتی ہے "بیٹی ارجمند بانو"۔ ارجمند بانو رومال سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے اور اُدھر جانے لگتی ہے۔ ممتاز بانو وہیں کھڑی رہتی ہے مگر اب وہ بھی دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے شہزادہ ابو جہانگیر مرزا اکبر بیگ آتے ہیں۔ پچاس پچپن سال کے نحیف الجثہ آدمی۔ صحت کے اعتبار سے اپنے باپ دادا سے قطعی مختلف، کمر جھکی ہوئی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے، لباس سیاہ اچکن جس کے تمام بٹن بند ہیں، چوڑی دار پاجامہ، سر پر دوپلی، دائیں ہاتھ میں عصا جس کے سرے پر چاندی کا خول چڑھا ہوا ہے، چہرہ بتا رہا ہے کہ یہ شخص بڑی کشمکش کے عالم میں سے گذر رہا ہے۔

شہزادہ صاحب آتے ہی کرسی پر گر پڑتے ہیں۔ دونوں بیٹیاں پاس پہنچ جاتی ہیں)

ارجمند بانو: تسلیم ابا حضور!

ممتاز بانو: تسلیم ابا جان!

شہزادہ صاحب: جیتی رہو (عصا کرسی کی پشت سے لگا کر) خدا تمھیں زمانے کی چشم بد سے بچائے (سانس درست کرنے کے لیے ذرا رک کر) بہت برا زمانہ آگیا ہے۔ نہ کبھی دیکھا نہ سنا۔

ارجمند بانو: ہاں ابا حضور!

شہزادہ صاحب: میری عدم موجودگی میں کوئی آیا تو نہیں تھا!

ارجمند بانو: کوئی نہیں ابا جان!

ممتاز بانو: آپی! وہ بنک کا چپڑاسی جو آیا تھا۔

شہزادہ صاحب: آیا ہو گا ــــ ان لوگوں کا تو کام ہی یہ ہے کہ شرفا کو پریشان کرتے پھریں۔

ارجمند بانو: (موضوعِ گفتگو بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے) ابا حضور! آج آپ نے ناشتہ بھی نہیں کیا تھا، کھانا چُن دوں۔

شہزادہ صاحب: نہیں بیٹی بھوک نہیں ہے۔

ارجمند بانو: ابا جان آپ کی صحت پہلے ہی کافی گر چکی ہے (ممتاز بانو سے) تازی جلدی سے دسترخوان بچھا دے!

ممتاز بانو: بہتر (جانے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب: (ہاتھ کے اشارے سے روک کر) نہیں تازی بیٹی!

ممتاز بانو: آپ اس طرح فکر نہ کریں ابا جان! جو ہونا ہے وہ تو ہو کر ہی رہے گا۔

ارجمند بانو: (بہن کو گھورتے ہوئے) تازی کا مطلب ہے ابا حضور! کہ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ بہتری کی کوئی صورت ضرور نکل آئے گی۔

شہزادہ صاحب: بہتری کی صورت پیدا تو ہوئی ہے۔

ارجمند بانو : الحمدللہ!
ممتاز بانو : (جیسے اپنے کانوں پر اعتماد نہیں کر سکی) ابا جان! آپ نے فرمایا ہے قرض اُتر جائے گا۔
ارجمند بانو : انسان کوشش کرے تو ضرور کامیاب ہو جاتا ہے (ممتاز بانو سے مخاطب ہو کر) ابا جان نے حویلی کے لیے ایسی کوششیں کی ہیں کہ کوئی کیا کرے گا؟
شہزادہ صاحب : یہ ننگ و ناموس کا سوال ہے۔ حویلی ہاتھ سے نکل گئی تو سب کچھ ختم ہو گیا (اندوہناک لہجے میں) افسوس اس بات کا ہے کہ سب سے زیادہ دُکھ مجھے کسی غیر نے نہیں اس شخص نے پہنچایا ہے جسے دُنیا لختِ جگر کہتی ہے۔
ارجمند بانو : ابا جان! کچھ نہ کچھ تو ضرور کھا لیجئے ــــــ صبح سے بھوکے ہیں!
شہزادہ صاحب : نہیں بیٹی! بھوک نہیں ہے، البتہ آرام ضرور کروں گا کچھ دیر۔

(شہزادہ صاحب اُٹھ کر عصا سنبھالتے ہیں اور دروازے کی طرف جانے لگتے ہیں۔ پھر یکایک رُک جاتے ہیں)

ہاں بیٹی! یاد آیا۔ دو چار دن تک نہایت معزز مہمان آ رہے ہیں۔ ابھی سے اہتمام شروع ہو جانا چاہیے، سمجھ لیا۔

ارجمند بانو : بہتر ابّا حضور!

ممتاز بانو : مہمان — کون ابّا جان!

شہزادہ صاحب : نواب سرفراز خاں کے گھر والے — میری ارجمند بانو حویلی سے نکل کر محل میں رہے گی۔

ممتاز بانو : ابّا جان!

(کچھ کہنا چاہتی ہے مگر رک جاتی ہے۔ ارجمند بانو شرما کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیتی ہے)

شہزادہ صاحب : نواب سرفراز خاں سات پُشت سے نواب چلے آرہے ہیں۔ ابّا جان مرحوم کے جگری دوست تھے۔ دراصل ان کا خاندان ہماری نسل ہی کی ایک معزز شاخ ہے۔

(ممتاز بانو زمین پر نگاہیں جمائے کھڑی ہے — شہزادہ صاحب دروازے سے نکل جاتے ہیں۔ دونوں لڑکیاں انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہتی ہیں)

ممتاز بانو : ابّا جان — کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو سمجھ ہی نہیں سکی۔

(ارجمند بانو کوئی جواب نہیں دیتی)

آپی! میں کیا کہہ رہی ہوں!

ارجمند بانو : (لہجے میں دبا دبا غم) ابّا جان جو کچھ کریں گے۔ ہماری بہتری کے لیے کریں گے۔ میں صرف یہ جانتی ہوں۔

ممتاز بانو: مگر سوچئے تو آپی! نواب سرفراز خاں کی عمر خدا جھوٹ نہ بلوائے، ابا جان سے بھی کم از کم آٹھ دس سال زیادہ ہو گی۔ اور پھر تین بیویاں پہلے ہی ان کے گھر میں ہیں۔

ارجمند بانو: مجھ سے ایسی باتیں نہ کرو تازی!

ممتاز بانو: تو کس سے کروں آپی!

ارجمند بانو: کسی سے نہیں۔ کسی سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔

ممتاز بانو: آپی! اگر میں آپ کی بجائے ہوتی تو انکار کر دیتی۔

ارجمند بانو: تمہارے دیدوں کا تو پانی مر گیا ہے۔

(کرسی میں بیٹھ کر کاڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے)

ممتاز بانو: ابا جان کے سر پر صرف ایک دھن سوار ہے — صرف ایک دھن — اور کچھ سوچتے ہی نہیں۔

(ارجمند بانو اسے گھور کے دیکھتی ہے — ممتاز بانو بھی کرسی میں بیٹھ جاتی ہے۔ جہانگیر آتا ہے۔ انیس بیس برس کا نوجوان — چہرہ بھرا بھرا۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے، پاؤں میں بوٹ، بھائی کو دیکھتے ہی ارجمند بانو اور ممتاز بانو پر حیرت اور مسرت کی ملی جلی کیفیت چھا جاتی ہے، فوراً اٹھ بیٹھتی ہیں)

ارجمند بانو: جہانگیر تم! —

ممتاز بانو: ابا جان سے جھگڑا کر کے بہنوں کو بھی فراموش کر دیا، خون سفید ہو گیا

ہے شاید تمہارا!

جہانگیر: میں کیا کرتا۔ ابّا جان مجھے دشمن سمجھتے ہیں، میری صورت بھی دیکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

ارجمند بانو: تم معافی کیوں نہیں مانگ لیتے بھیّا! تمھیں اس بات کا احساس نہیں ہوتا کہ بے چارے کس قدر پریشان رہتے ہیں۔ کتنی بڑی مصیبت ٹوٹ پڑی ہے اُن پر۔

جہانگیر: وہ تو ہم سب کو جہنم میں جھونکنے کا ارادہ کر چکے ہیں۔

ارجمند بانو: پھر وہی باتیں — میں تو سمجھی تھی تم نیک ارادے سے آئے ہو مگر —

جہانگیر: میں ایک خاص ارادے ہی سے آیا ہوں۔

ارجمند بانو: خاص ارادہ؟ — کیا ہے خاص ارادہ! خدا کے لیے تلخی نہ بڑھاؤ — اگر تمھارے خیالات وہی ہیں تو وہ تمھیں یہاں دیکھ کر —

جہانگیر: (جلدی سے) میں جانتا ہوں۔

ارجمند بانو: اللہ بتاؤ نا کیا ارادہ ہے تمھارا — کوئی ایسی بات نہ کرنا — ورنہ نہ ملو ان سے — یہ بہتر ہے، سُنا جہانگیر؟

(دروازے پر شہزادہ صاحب آتے ہیں اور چُپ چاپ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر بیٹے کو شعلہ ریز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں)

شہزادہ صاحب: تمھیں میری حویلی میں آنے کی اجازت کس نے دی؟ یہاں تمھارا کیا کام ہے؟

(ارجمند بانو خوفزدہ سی ہو جاتی ہے۔ ممتاز بانو بھی سہم جاتی ہے مگر اس کی حالت بھی جیسی نہیں۔ جہانگیر پر مطلقاً کوئی اثر نہیں ہوتا)

جہانگیر: میں یہاں اپنا ایک نہایت ناخوشگوار فرض ادا کرنے کے لیئے آیا ہوں۔

شہزادہ صاحب: تم اور فرض؟ روشنی اور تاریکی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر تمھیں اپنے فرض کا ذرہ برابر بھی احساس ہوتا تو میرے ساتھ شامل ہو کر خاندانی ننگ و ناموس کی حفاظت کرتے، بزدلوں کی طرح بھاگ نہ جاتے۔

جہانگیر: ابا جان! آپ جس چیز کو خاندانی ننگ و ناموس کہتے ہیں وہ میری نظروں میں بوسیدہ اینٹوں کے ایک بے ترتیب ڈھیر کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ میں اس کے لیے اپنے دل و دماغ کا سرمایہ تباہ نہیں کر سکتا۔

شہزادہ صاحب: تم ابھی تک میری حویلی کو بوسیدہ اینٹوں کا ایک ڈھیر سمجھتے ہو؟

جہانگیر: ابا جان! اس کے علاوہ یہ کیا ہے۔ میں مانتا ہوں ہمارے کئی بزرگوں نے ان دیواروں کے اندر بڑی نوابانہ شان سے زندگی بسر کی تھی —— مگر ابا جان! آپ جس زمانے کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ زمانہ بہت پیچھے جا کر ماضی کا حصہ بن چکا ہے۔ اس حویلی کی بنیادیں کمزور ہو چکی ہیں۔ اس کے در و دیوار پر کائی جم چکی ہے اور جو خاندان اس کے اندر رہتا تھا، اس کی روایات ختم ہو چکی

ہیں۔ نئے زمانے کا سورج طلوع ہو رہا ہے لیکن آپ ابھی تک ماضی کی سرد راکھ سے زندگی کی گرمی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ محض فریب ہے ۔۔ ایک بہت بڑا دھوکا ہے۔

شہزادہ صاحب: اس قسم کے فقرے تم پہلے بھی کئی بار کہہ چکے ہو اور آج بھی کہہ رہے ہو ۔۔ میرے کان ان سے بیزار ہیں اور میں تمہاری شکل سے بھی بیزار ہوں!

جہانگیر: یہ میری بدقسمتی ہے۔

شہزادہ صاحب: بس یہی کچھ کہنے کے لیے آئے تھے تم!

جہانگیر: نہیں۔

شہزادہ صاحب: نہیں؟

(غضب ناک نظروں سے جہانگیر کو دیکھتا ہے)

جہانگیر: آپی! (بہنوں سے مخاطب ہو کر) تم لوگ ذرا ادھر چلے جاؤ۔

(دونوں بہنیں ایک دوسری کو دیکھتی ہیں، ایک دو لمحے دیکھتی رہتی ہیں۔ پھر ممتاز بانو دروازے کی طرف قدم اٹھاتی ہے۔ ارجمند بانو بھی اس کے پیچھے پیچھے جانے لگتی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جانا نہیں چاہتیں۔ مجبور ہو کر جا رہی ہیں۔ دونوں نظروں سے دور ہو جاتی ہیں)

شہزادہ صاحب: کہو!

جہانگیر: (لہجے میں ملائمت) دیکھئے ابا جان! آپ نے اب تک جو کچھ کیا ہے
اس کی وجہ سے آپ کے مختصر خاندان کو بہت دُکھ اٹھانے پڑے ہیں۔
آپ اپنے جنون میں مبتلا رہے اور ہماری اماں بغیر دارو کے رحلت فرما گئیں۔
آپ کو ہمیشہ اس بات کی فکر رہی ہے کہ کوئی زندہ رہے یا سسک سسک کے
مر جائے لیکن آپ کی اس منحوس حویلی کا ایک ذرہ بھی کسی دوسرے کے قبضے میں
نہ چلا جائے، آپ اس کے لیے دیوانے ہو گئے ہیں۔ سوائے حویلی کے اور
کچھ سوجھتا ہی نہیں آپ کو ـــ آپ نے اپنی زندگی کی قیمتی سے قیمتی شے بھی
اس کے لیے قربان کر دی ہے، میں نے آپ کی مخالفت کی اور آپ نے
مجھے ذلیل کر کے یہاں سے نکال دیا ـــ میں نے یہ ظلم بھی برداشت کر لیا۔
ـــ مگر ابا جان! میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ بات برداشت نہیں کر سکتا کہ
آپ میری بہن کی زندگی اس بوسیدہ حویلی کی بھینٹ چڑھا دیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا
یہ کبھی نہیں ہوگا ابا جان!

شہزادہ صاحب: کیا مطلب؟

جہانگیر: آپ آپی کا ہاتھ اس پاجی سرفراز خاں کے ہاتھ میں دینے کا ارادہ کر چکے
ہیں جس کے پاجی پن کی شہرت شہر کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے اور یہ صرف
اس لیے کہ سرفراز خاں اس حویلی کا قرض ادا کر دیں۔

شہزادہ صاحب: میری لڑکی تو اب سرفراز ہی کے محل میں جائے گی۔

جہانگیر: ایسا نہیں ہو گا۔
شہزادہ صاحب: تم کون ہو کچھ کہنے والے، تمہارا میرے اور میری بچیوں کے ساتھ کیا واسطہ، شرم نہیں آتی یہ بات کہتے ہوئے۔ ہمیں مصیبت میں چھوڑ کر چلے گئے اور آج آئے ہو باتیں بنانے کے لئے اور ——————
جہانگیر: (باپ کے الفاظ کاٹتے ہوئے) آپ غلط کہہ رہے ہیں ابا جان! میں آپ کو اور اپنی بہنوں کو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ایک سعادت مند بیٹے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ اپنے بوڑھے باپ کو آرام پہنچاؤں اور وہ فرض بھی ادا کروں جو میری بہنوں کی طرف سے مجھ پر عائد ہوتا ہے۔ مگر آپ نے میرے اور میرے فرض کے درمیان یہ منحوس حویلی کھڑی کر دی۔ میں کیا کرتا۔ ایسی حالت میں میں کیا کر سکتا تھا؟ آپ خود ہی فرمائیں! خدا کے لیے مجھے اپنا فرض ادا کرنے دیجئے۔ یہ بوسیدہ دیواریں ہمارے قبضے میں نہیں رہ سکتیں، ان کا خیال چھوڑ دیجئے!
شہزادہ صاحب: (اپنے دونوں ہاتھ شمالی اور جنوبی دیواروں کی طرف پھیلا کر) تم انہیں بوسیدہ دیواریں کہتے ہو — یہ بوسیدہ دیواریں ہیں کیا؟ اگر تمہاری آنکھوں پر پردہ نہ پڑ چکا ہوتا تو تم دیکھتے کہ یہی دیواریں صدیوں سے ہماری خاندانی عظمت کا مقدس بوجھ اٹھائے کھڑی ہیں۔ انہی دیواروں کے ذرے ذرے میں ہمارے ننگ و ناموس کے چراغ روشن ہیں۔ جب تک یہ دیواریں ہمارے

پاس ہیں ہماری عزت ہمارا خاندانی ننگ وناموس اور ہماری شان وشوکت زندہ اور سلامت ہے، مگر جب اس حویلی کے دروازے ہم پر بند ہو گئے ہم ہر اُس چیز سے محروم ہو جائیں گے جسے ہمارے محترم آباو اجداد نے بطور ورثے کے ہمارے سپرد کیا تھا۔ امارت ختم ہو گئی لیکن جب تک یہ دیواریں ہمارے ارد گرد کھڑی ہیں، ہماری عظمت برقرار ہے۔ ہماری عزت سلامت اور ہماری نیک نامی محفوظ ہے۔ یہ صرف اسی حویلی کی برکت ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی لوگ ہمیں شہزادہ صاحب کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، تم اسی درخت کو کاٹنے پر تلے ہو، جس کی بلند شاخ پر بیٹھ کر آسمان کی ہمسری کر سکتے ہو۔

جہانگیر: اباجان! میں اس درخت کو کیا کاٹوں گا اسے تو زمانے کا آرہ خود ہی کاٹ کر رکھ دے گا۔

شہزادہ صاحب: میں پوچھتا ہوں جب تمھیں میری حویلی سے کوئی واسطہ نہیں تو اس حویلی کے اندر رہنے والوں سے کیا واسطہ ہو سکتا ہے؟

جہانگیر: میں حویلی کی آپ کی طرح پرستش نہیں کر سکتا اباجان! آپ نے اپنی ساری دُنیا ان دیواروں کے اندر آباد کر رکھی ہے، میری دُنیا یہ نہیں ہے — کائنات کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔

شہزادہ صاحب: تو جاؤ کائنات کی وسعتوں میں اُڑتے پھرو — یہاں تمھارا کیا کام؟

جہانگیر: ابا جان! میں آپ کی خدمت میں بڑے ادب کے ساتھ یہ گزارش پیش کرنے کے لیئے آیا ہوں کہ حویلی کے لیے اپنی اولاد کی زندگی تباہ نہ کریں!

شہزادہ صاحب: اپنی اولاد کی بہتری میں خوب سمجھتا ہوں۔

جہانگیر: آپ نے سوچا ایک عیاش شخص کے گھر میں آپ کی بیٹی کا کیا حال ہوگا؟

شہزادہ صاحب: میں جو کچھ کر رہا ہوں خوب سوچ سمجھ کر کر رہا ہوں۔

جہانگیر: نہیں ابا جان! آپ نے کچھ نہیں سوچا، اگر آپ نے ایک باپ کی طرح اس معاملے پر غور کیا ہوتا تو سرفراز خاں کے نام ہی سے نفرت کرتے۔ چہ جائیکہ آپ اپنی لڑکی اس مردود کے گھر بھیجنے کا ارادہ کرتے ایسا ...... کرنے سے آپ کی حویلی آپ کے قبضے میں رہے گی — مگر آپ کی بیٹی سرفراز خاں کی عیاشیوں کا شکار ہو کر سسک سسک کر مر جائے گی۔ خدارا سوچیے آپ کیا کر رہے ہیں اور کیا نتیجہ ہوگا اس کا؟ مجھے بتائیے ابا جان! کیا آپ ان بے جان دیواروں کے لیے اپنی بیٹی بیچ دیں گے۔ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اٹھا کر ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دیں گے؟

شہزادہ صاحب: اس قسم کے ذلیل لفظ منہ سے نکالتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ نواب سرفراز خاں اس رشتے کے بعد اس خاندان ہی کے ایک رکن ہو جائیں گے۔ میرا بیٹا خاندانی عزت کا دشمن ہے — خدا نے مجھے دوسرا بیٹا دے دیا ہے۔ میں اس معاملے میں ہر طرح مختار ہوں، جاؤ میری نظروں سے

دُور ہو جاؤ!

جہانگیر: میری بہن اس شخص کے گھر میں نہیں جائے گی۔

شہزادہ صاحب: میں نے جو کچھ طے کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ میرا فیصلہ اٹل ہے۔

جہانگیر: ابا جان!

شہزادہ صاحب: ایک لفظ نہیں — جاؤ چلے جاؤ یہاں سے۔

جہانگیر: آپ آپی کو اس حویلی کو بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔

شہزادہ صاحب: میں کہتا ہوں چلے جاؤ۔ اپنی ذلیل شکل میری آنکھوں سے دُور لے جاؤ۔

جہانگیر: میں یہیں رہوں گا ابا جان! اور دیکھوں گا وہ عیاش نواب کس طرح یہاں آنے کی جرأت کر سکتا ہے — میں اپنی زندگی کی قیمت پر بھی یہ شرمناک سودا بازی نہیں ہونے دوں گا۔

شہزادہ صاحب: (زیادہ گرج کر) چلے جاؤ — جاتے ہو یا نہیں تم! میں تمھیں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی مقدس حویلی میں نہیں دیکھ سکتا۔ جاؤ دفع ہو جاؤ!

(ارجمند بانو اور ممتاز بانو بھاگ کر آتی ہیں۔ باپ اور بھائی کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہیں)

ممتاز بانو: جہانگیر۔ اُدھر چلے جاؤ تم۔

شہزادہ صاحب: نہیں ادھر اُدھر ہرگز نہیں، اس کا مکروہ سایہ بھی ان متبرک دیواروں پر نہیں پڑنا چاہیے۔ اس سے کہو یہاں سے دفع ہو جائے!

ممتاز بانو: جہانگیر چلو نا۔

(ممتاز بانو بھائی کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے اور دروازے کی طرف جانے لگتی ہے ارجمند بانو اس کے پیچھے پیچھے قدم اُٹھا رہی ہے — شہزادہ صاحب شعلہ ریز نگاہوں سے بیٹے کو دروازے میں سے نکلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں)

دُوسرا منظر

(شہزادہ صاحب کی خواب گاہ۔ اس منظر میں سٹیج کا صرف وہی حصہ نظر آتا ہے جو ایک ٹیبل پر پڑے ہوئے لیمپ کی مدھم روشنی میں ہے۔ رات نصف کے قریب گزر چکی ہے۔ شہزادہ صاحب پلنگ کے اوپر سامنے کی دیوار سے نشست لگائے نوٹوں کے بنڈل ہاتھی دانت کے ایک صندوقچے میں ڈال رہے ہیں، فضا پُرسکون ہے —

باہر سے ممتاز بانو کی ہلکی سی آواز آتی ہے "ابا جان!" شہزادہ صاحب سر اُٹھا کر مشرقی جانب دیکھتے ہیں۔ ممتاز بانو کی دوبارہ آواز آتی ہے، شہزادہ صاحب صندوقچہ بند کر دیتے ہیں)

شہزادہ صاحب: ممتاز بانو! کیا ہے بیٹی! پریشان کیوں ہو؟

(ممتاز بانو اندر آتی ہے۔ نیم تاریکی میں اس کا سارا جسم نظر نہیں آتا)

ممتاز بانو: میں کچھ کہنے آئی ہوں ابّا جان!

شہزادہ صاحب: کہو!

ممتاز بانو: میں یہ کہنے آئی ہوں ابّا جان! حالات خطرناک نقطے پر پہنچ گئے ہیں۔

شہزادہ صاحب: تمھارے ذہن کو وہ بدبخت جہانگیر مسموم کر رہا ہے ورنہ حالات بالکل توقع کے مطابق ہیں۔۔۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ حویلی ہمارے پاس نہیں رہے گی، الحمدللہ یہ خطرہ ہمیشہ کے لیے دُور ہو گیا ہے، نواب صاحب نے فرمایا ہے۔ میں برات لے کر اس وقت یہاں آؤں گا جب حویلی سے بنک والوں کا کوئی تعلق باقی نہیں رہے گا۔۔۔ چنانچہ اُنھوں نے اس کا انتظام بھی کر دیا ہے۔۔۔ خدا کا شکر ہے میں اب ان کا سارا قرض ادا کر دوں گا!

ممتاز بانو: ابّا جان! اگر یہ حویلی ہمارے قبضے سے نکل جائے تو کیا حرج ہے؟

شہزادہ صاحب: (بیٹی کو گھور کر دیکھتے ہوئے) پوچھتی ہو کیا حرج ہے۔ اگر حویلی ہمارے پاس نہ رہی تو باقی رہ کیا جائے گا!

ممتاز بانو: ابّا جان! آپ یہ ارادہ دل سے نکال دیں۔

شہزادہ صاحب: کونسا ارادہ!

ممتاز بانو: آپی کو نواب سرفراز خاں کے ہاں بھیجنے کا۔

شہزادہ صاحب: کیا کہنا چاہتی ہو تم —!

ممتاز بانو: ابّا جان! جو کچھ میں محسوس کر رہی ہوں وہ آپ محسوس نہیں کر سکتے۔ حویلی ہمارے پاس نہ رہی تو شائد ہماری خاندانی عظمت برقرار نہیں رہے گی۔ لیکن ابّا جان! دوسری صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی کسی نہایت عزیز ہستی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں۔

شہزادہ صاحب: ممتاز بانو! میں سمجھتا تھا تم بہت ذہین اور بیدار مغز بچّی ہو۔ چنانچہ میں نے ہمیشہ تمھاری ذات پر فخر کیا ہے مگر آج تم جس قسم کی باتیں کر رہی ہو۔ وہ میری توقع کے بالکل خلاف ہیں، اس کم بخت نے اپنے زہریلے خیالات سے تمھیں بھی متاثر کر لیا ہے اور مجھے اس کا بہت افسوس ہے۔

ممتاز بانو: ابّا جان! میں صرف یہی عرض کروں گی کہ میں جو کچھ محسوس کر رہی ہوں وہ آپ محسوس نہیں کر سکتے!

شہزادہ صاحب: تم نے کیا محسوس کیا ہے؟

ممتاز بانو: (ذرا توقف کے بعد) ابّا جان! آپ کو معلوم نہیں، جہانگیر نے کیا کہا تھا آپ کے سامنے؟

شہزادہ صاحب : میں ان باتوں سے نہیں ڈر سکتا!

ممتاز بانو : ابا جان! آپ جس چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں اسے پورا کر کے چھوڑتے ہیں ـــــ آخر وہ بھی آپ کا بیٹا ہے، وہ یہ شادی نہیں ہونے دے گا ـــــ اس نے کہا تھا میں دیکھوں گا وہ عیاش نواب کس طرح یہاں آتا ہے اور ـــــ ان الفاظ کا مفہوم کتنا خوفناک ہے ـــــ آپ نہیں جانتے ابا جان!

شہزادہ صاحب : بیٹی! میں جانتا ہوں ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے؟ مگر وہ کر کیا سکتا ہے؟ ـــــ انتہائی خوفناک اقدام یہ ہے کہ وہ نواب صاحب پر حملہ کر دے گا اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا، مگر اس سے پہلے کہ وہ نواب صاحب پر بری نظر ڈالے اسے اپنے باپ کی بوڑھی ہڈیوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔

ممتاز بانو : تو یہ حادثہ کتنا دلخراش ہوگا ابا جان!

شہزادہ صاحب : (اطمینان کے ساتھ) بیٹی تازی! تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو ـــــ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میری طرح تم بھی مطمئن رہو ـــــ تمہاری بہن بڑی شان کے ساتھ نواب صاحب کے محل میں جائے گی اور اس ٹھاٹھ سے رہے گی جو ٹھاٹ کبھی ہمارے خاندان کو نصیب تھا۔

ممتاز بانو : نہیں ابا جان!

شہزادہ صاحب : معلوم ہوتا ہے اس وقت تمہارے حواس جواب دے چکے

ہیں۔

ممتاز بانو: آج کا واقعہ ہے ابا جان! جہانگیر نے آپی سے کہا "آپی! اگر تم انکار کر دو تو معاملہ سلجھ سکتا ہے۔"

شہزادہ صاحب: میری بیٹی انکار کر دے ۔۔ میں جانتا ہوں یہ قیامت تک ممکن نہیں۔ وہ شاہی خاندان کی لڑکی ہے۔ کبھی خفیف الحرکتی کا شکار نہیں ہو سکتی!

ممتاز بانو: ابا جان! جہانگیر کے پے در پے اصرار پر انھوں نے اثبات میں سر ہلا دیا ہے۔

شہزادہ صاحب: کیا مطلب؟ (گویا انھیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا) کیا کہہ رہی ہے تو؟

ممتاز بانو: میں جانتی ہوں کہ آپی باپ کے سامنے انکار کی جرأت نہیں کر سکتی مگر انھوں نے بھائی کے سامنے بھی اثبات میں سر ہلا دیا ہے۔

شہزادہ صاحب: میں نہیں مانتا!

ممتاز بانو: آپ نہیں مانتے ۔۔ آپ نہیں مانیں گے۔ لیکن میں جانتی ہوں، آپی کے دل میں کیا ارادہ پرورش پا چکا ہے ۔۔ وہ کیا سوچ رہی ہیں ۔۔ اس الجھن کو سلجھانے کے لیے ان کے دماغ میں کیا تدبیر آئی ہے ابا جان! خدا کے لیے اس معاملے پر غور کیجیے! حویلی چلی جائے تو ہمیں صرف اس بات کا رنج ہو گا کہ ہمارے خاندان کی عظمت کی یادگار ہمارے پاس نہیں رہی۔

لیکن اگر آپ کو اس بڑھاپے میں اپنے سامنے بیٹی کی نعش دیکھنی پڑے تو کیا ہوگا

— تو کیا ہوگا ابّا جان! — ابّا جان!!

(شہزادہ صاحب چُپ چاپ بیٹی کو دیکھتے رہتے ہیں)

شہزادہ صاحب : ممتاز بانو! یہ فضول خیال اپنے دماغ سے نکال دو —

وہ ملعون جہانگیر اس قسم کی تدبیروں سے میری ہمت اور میرے ارادوں کو

شکست نہیں دے سکتا! تم بے فکر ہو کر سو رہو۔ ارجمند بانو سے میں صبح

ملوں گا اور یہ کام بخیر و خوبی انجام پا جائے گا — جاؤ اب تم!

ممتاز بانو : ابّا جان!

شہزادہ صاحب : میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔

ممتاز بانو : ابّا جان! —

شہزادہ صاحب : جاؤ اب تم — میں کہتا ہوں بے فکر رہو — بالکل بے فکر۔

(ممتاز بانو کھڑی رہتی ہے۔ شہزادہ صاحب ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر پھیرتے ہیں)

جاؤ بیٹی! میری بچّی!!

(شہزادہ صاحب تکیے پہ سر رکھ دیتے ہیں۔ ممتاز بانو مایوسانہ اُٹھتی ہے اور

اندھیرے میں غائب ہو جاتی ہے)

تیسرا منظر

(شہزادہ صاحب کی خواب گاہ۔ اس کی ایک جھلک دوسرے منظر میں دکھائی جا چکی ہے۔ چونکہ وہ رات کا وقت تھا اس لیے ہمیں صرف وہی حصہ نظر آیا تھا جو لیمپ کی روشنی میں تھا۔ مگر اب پورا کمرہ ہمارے سامنے ہے۔ یہ کمرہ پہلے منظر کے کمرے سے نصف ہو گا۔ کمرے کی سب سے نمایاں چیز سامنے کی دیوار سے لگا ہوا ایک طویل و عریض پلنگ ہے۔ پلنگ کے اوپر ہاتھی دانت کا وہ صندوقچہ پڑا ہے۔ جسے ہم دوسرے منظر میں دیکھ چکے ہیں۔ صندوقچے کا ڈھکنا کھلا ہے۔ صندوقچے کے ارد گرد کچھ کاغذات بکھرے پڑے ہیں، پلنگ کے سرہانے کی طرف ایک تپائی کے اوپر شہزادہ صاحب کا عصا اور پاندان پڑا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ کتابیں بھی نظر آ رہی ہیں، دروازہ مشرقی دیوار میں ہے جس کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج خالی دکھائی دیتی ہے ––– باہر شہزادہ صاحب کی گرجتی ہوئی آواز گونج رہی ہے "ارجمند بانو–تازی! کہاں ہو تم لوگ" ––– کسی قدر دور سے ارجمند بانو کی آواز آتی ہے "ابا جان!" ––– شہزادہ صاحب دروازے میں داخل ہوتے ہیں۔ سخت گھبرائے ہوئے ہیں ––– پیشانی شکن آلود ہے)

شہزادہ صاحب: آج میری آنکھوں کو یہ بھی دیکھنا تھا — یہ قیامت بھی ٹوٹنی تھی مجھ پر!

(کمرے میں آتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے ارجمند بانو، ممتاز بانو اور جہانگیر آتے ہیں)

ارجمند بانو: کیا ہوا ابا حضور!

شہزادہ صاحب: تمام کا تمام روپیہ غائب ہو گیا۔ اس پاپی جہانگیر نے میرے کمرے میں پہنچ کر صندوقچہ کھولنے کی جرأت کی ہے!

(شہزادہ صاحب غضب ناک نگاہوں سے جہانگیر کو دیکھتے ہیں)

جہانگیر: ابا جان! میں آپ کے کمرے میں نہیں آیا۔

شہزادہ صاحب: تو اور کون آیا ہے۔ تجھ میں اتنی جرأت کہ میری خواب گاہ میں پہنچ کر میرے صندوقچے کا تالا توڑ کر سارا روپیہ لے جائے۔

جہانگیر: میں قسم کھا کر کہتا ہوں — میں نے یہ حرکت نہیں کی۔

شہزادہ صاحب: تمہارے سوا اور کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا — اگر تمہارے ملعون جسم میں خاندانی شرافت کا ایک ذرہ بھی باقی ہے تو رقم واپس کر دو — تو سمجھتا ہے کہ میں چیخ پکار کر کے خاموش ہو جاؤں گا۔ ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ میں تجھے جیل کی سلاخوں ہی کے پیچھے نہیں، پھانسی کے تختے پر بھی دیکھ سکتا ہوں اپنے ذلیل ارادے کو پورا کرنے کے لئے تو نے چوری کی ہے — تمام کی

تمام رقم چُرالی ہے۔ کس قدر ذلیل حرکت ہے یہ۔ کتنا کمینہ انسان ہے تُو!
لاؤ روپیہ۔ (پورے زور سے گرج کر) لاؤ میرا روپیہ۔ لاؤ!

جہانگیر: (بدستور اطمینان سے) میں نے روپیہ نہیں نکالا۔

ارجمند بانو: (بھائی کے پاس پہنچ کر) جہانگیر! یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیوں ہمیں خاک میں ملانے پر تُلے ہو۔ خُدا کے لیئے۔ رسُول کے لیئے۔

(رونے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب: یہ سمجھتا ہے میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ یہ معاملہ پولیس کے پاس بعد میں جائے گا۔ پہلے تو میں۔

(شہزادہ صاحب صندوقچہ اٹھا کر بیٹے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ممتاز بانو جلدی سے درمیان میں آجاتی ہے)

ممتاز بانو: ابّا جان! روپیہ میں نے نکالا تھا!

شہزادہ صاحب: کیا؟

ممتاز بانو: روپیہ میں نے نکالا تھا!

(شہزادہ صاحب کے ہاتھ خود بخود رُک جاتے ہیں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیٹی کو دیکھنے لگتے ہیں، ارجمند بانو اور جہانگیر کھڑے ہیں۔ ممتاز بانو جلدی سے نکل جاتی ہے۔ تین چار لمحوں تک سٹیج پہ یہی عالم رہتا ہے۔ ممتاز بانو واپس آتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں رومال میں کوئی چیز لپٹی ہوئی ہے۔ رومال باپ

کی طرف بڑھاتی ہے۔ شہزادہ صاحب صندوقچہ پلنگ پر رکھ کر رومال پکڑ لیتے ہیں۔ اس میں سے راکھ نیچے گرنے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب : یہ کیا۔ راکھ!

ممتاز بانو : ابّا جان! یہ وہی نوٹ ہیں جو اس صندوقچے میں بند تھے ۔۔ میں نے آپ کی عدم موجودگی میں تالا توڑ ڈالا ۔۔ نوٹوں کو خاکستر کر دیا۔ میں پاگل ہو گئی تھی ابّا جان! مجھے اور کچھ بھی نہیں سُوجھا ۔۔ مجھے کچھ بھی نہ سوجھ سکا۔ ایک طرف بہن کی نعش نظر آئی ۔۔ دوسری طرف ۔۔ دوسری طرف بھائی کو پولیس کے نرغے میں دیکھا ۔۔ میں پاگل ہو گئی ۔۔ پاگل ہو گئی ابّا جان!

(ممتاز بانو باپ کے قدموں پر گر پڑتی ہے ۔۔ اور سسکیاں بھرنے لگتی ہے

شہزادہ صاحب بُت بنے کھڑے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی بھیانک سپنا دیکھ رہے ہیں ۔۔ رومال سے راکھ ابھی گر رہی ہے ۔۔ جہانگیر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ پردہ گرتا ہے)

چوتھا منظر

ایک ایسا کمرہ جو پہلے منظر کے کمرے سے بھی بڑا ہے۔ سادہ ۔ سامنے کی دیوار پر شہزادہ صاحب کے باپ دادا کی تصویریں آویزاں ہیں جو پہلے منظر میں دکھائی گئی تھیں۔ آنے جانے کے لیے دو دروازے، ایک مشرقی دیوار میں جو حویلی کے اندر

جاتا ہے اور دوسرا مغربی دیوار میں جو باہر جاتا ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک اُونچی سنہری کرسی، اس کرسی پر شہزادہ صاحب کے والد اور دادا بیٹھا کرتے تھے کرسی کی دائیں جانب ایک تپائی کے اُوپر سنگِ مرمر کا وہ تاج محل جسے ہم پہلے منظر میں دیکھ چکے ہیں اور اس کے علاوہ کپڑوں کے چند جوڑے۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے۔ کرسی خالی نظر آتی ہے۔ کرسی کے پاس تین آدمی کھڑے ہیں سیفیروز، نوازش اور رحمت، فیروز اور نوازش ادھیڑ عمر کے ہیں۔ لباس کرتہ، پاجامہ، تیسرا یعنی رحمت ان سے چھوٹا ہے ــ باہر شور برپا ہے۔ معلوم نہیں ہوتا اس شور کی نوعیت کیا ہے۔ یہ شور گھٹتا بڑھتا رہتا ہے مگر رہتا ہے منظر کے اختتام تک)

نوازش: سمجھ میں نہیں آتا ہمیں کیوں بلایا گیا ہے؟

فیروز: ہمرے کو کیا کھبر۔ رحمت جانے ہے۔

رحمت: میں کیا جانوں، شہزادہ صاحب ملے، کہنے لگے، ہمارے خاندان کے جتنے ملازم شہر میں رہتے ہیں سب کے سب حویلی میں آئیں۔

فیروز: کاہے کو ــ کھیر بانٹی جائے گی کیا؟

رحمت: کچھ نہ کچھ تو ضرور بانٹا جائے گا! ــ وہ تپائی پہ مال تو پڑا ہے۔

فیروز: پر یار بات کچھ ہمری سمجھ میں ناہیں آوت ہے۔ بجھا دیا ہمرا گھر کیا روشن کرے گا؟

رحمت: گھبراتے کیوں ہو۔ سمجھ میں آجائے گا سب کچھ! — ابھی شہزادہ صاحب آجاتے ہیں۔

(مشرقی دروازے میں شہزادہ صاحب آتے ہیں۔ نہایت شاندار نوابی لباس۔ یہ لباس ان کے والد مرحوم زیب تن فرماتے ہوں گے — سر پر چوگوشیہ جھکتی ہوئی ٹوپی، سنہری قبا، چوڑی دار ریشمی پاجامہ، دائیں ہاتھ میں عصا۔ تینوں شخص ان کی یہ شان دیکھ کر ٹھٹک جاتے ہیں اور جھک کر آداب بجا لاتے ہیں۔

شہزادہ صاحب نوابانہ وقار کے ساتھ کرسی میں بیٹھ جاتے ہیں)

رحمت: (سر جھکا کر) آداب عرض شہزادہ صاحب قبلہ!

فیروز: (مودبانہ جھک کر) تسلیمات۔ حجور!

شہزادہ صاحب: ہم نے کہا تھا ہمارے تمام قدیمی نمک خوار آئیں۔ صرف تین آئے ہیں۔ باقی کیوں نہیں آئے۔ کیا انھیں اطلاع نہیں دی گئی؟

فیروز: ہمرے کو اُن کی کھبر نہیں حجور!

رحمت: کچھ مر کھپ گئے ہیں — کچھ باہر چلے گئے ہیں اَن داتا!

نوازش: جی ہاں — جانی خانساماں تو میرے سامنے ڈھاکہ چلا گیا تھا سرکار!

شہزادہ صاحب: جانی کا کوئی بھائی وغیرہ بھی نہیں تھا — اسی کو لائے ہوتے!

فیروز: ہمرے کو یہ کھبر نہیں تھی حجور!

شہزادہ صاحب: تو تم تینوں آ گئے ہو — ہم خوش ہیں کہ تم نے نمک حلالی کا ثبوت دیا ہے۔ آج تک جس شخص نے بھی ہمارے خاندانِ ذی شان کی خدمت کی ہے — ہم اسے فراموش نہیں کریں گے!

رحمت: حضور کی بڑی مہربانی!

شہزادہ صاحب: ہمارے خلد آشیاں دادا جان اور جنت مکان والد صاحب قبلہ سال میں ایک مرتبہ ضرور اپنے ملازموں کو خلعت بخشا کرتے تھے۔ ہم اپنی اس پرانی رسم کو زندہ رکھیں گے! اگرچہ آج تم لوگ ہمارے ملازم نہیں ہو مگر تم نے اس عالی شان حویلی میں رہنے والوں کی خدمت کی ہے۔ ہم تمہاری پرانی خدمات کے صلے ہی میں تمھیں انعام دیں گے! — تمھیں معلوم ہے اس حویلی کی فضاؤں میں زروجواہر کی بارش برسائی گئی ہے — مانگنے والوں نے جو مانگا ہے اپنی جھولیوں میں اُس سے کہیں زیادہ پایا ہے۔ ان بلند اور باوقار دیواروں نے ہر اُس شخص کو سہارا دیا ہے جس نے سب دروازوں سے مایوس ہو کر ہمارا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔ ان جگمگاتی ہوئی چھتوں کے نیچے ہمارے وسیع دسترخوان پر ہر اُس آدمی کا خیر مقدم کیا گیا ہے جس نے اپنا دستِ طلب ہماری طرف بڑھایا ہے۔ آج ناہنجار زمانے کا رنگ دیکھو — خود حویلی میں رہنے والے ہی اس کے دشمن ہو گئے ہیں — ہمارے بدبخت بیٹے نے ہمیں شکست دینے کی کوشش کی — ہماری اپنی نورِ نظر نے ہماری

روٹی چھیننی چاہی مگر خدائے ذوالجلال کا احسان ہے کہ یہ جلیل القدر حویلی ـــ

(شہزادہ صاحب کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں)

آج بھی ہماری ہے ـــ ہمارے جیتے جی ـــ

(باہر شور ایک دم بڑھ جاتا ہے)

یہ شور کیسا ہے؟ ـــ کون بدتمیز شور کر رہا ہے؟

رحمت!

(شہزادہ صاحب رحمت کو دیکھ کر تپائی کی طرف اشارہ کرتے ہیں)

یہ انعام تمھارا ہے۔

رحمت: حضور "تاحشر سلامت رہیں!

(اور فیروز کو دیکھ کر)

اور یہ تمھارا (تاج محل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، فیروز تاج محل اٹھالیتا ہے)

فیروز: حجور! بڑی نواجش!

شہزادہ صاحب: وہ دروازہ بند کر دو جا کر۔

(نوازش مغربی دروازہ بند کر دیتا ہے، شور کم ہو جاتا ہے)

جس حویلی نے ـــ (زور زور سے سانس لینے لگتے ہیں)

رحمت: کیا بات ہے شہزادہ صاحب۔ آپ کی طبیعت ـــ

(مغربی دروازے پر زور زور سے دستک پڑنے لگتی ہے)

شہزادہ صاحب: (کھڑے ہو کر) ہم کہہ رہے ہیں — جس حویلی نے سالہا سال تک ہماری شان و شوکت کا ساتھ دیا ہے — وہ آج بھی ہمارے ننگ و ناموس کی حفاظت کرے گی — کسی غیر کا منحوس قدم یہاں نہیں آسکتا — ہرگز نہیں آسکتا — ہرگز نہیں آسکتا — یہ اونچی چھت ہمارے سروں پر قائم رہے گی — یہ بلند دیواریں — ہمارے اردگرد کھڑی — رہیں گی۔ ہماری عظمت کی یہ تابناک یادگار تا ابد سلامت — رہے گی — کوئی شخص اس کا ایک ذرہ بھی چھین کر نہیں لے جا سکتا — کوئی غیر قدم یہاں نہیں — آسکتا — ہم — ہم —

(شہزادہ صاحب دھم سے زمین پر گر پڑتے ہیں — نوازش، فیروزہ اور رحمت — تینوں "شہزادہ صاحب" کہتے ہوئے اُنھیں اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں — شہزادہ صاحب کی آنکھیں پتھرا چکی ہیں — چہرے کا رنگ نیلا پڑ گیا ہے — مُنہ سے خون بہ رہا ہے — رحمت زور زور سے "شہزادہ صاحب، شہزادہ صاحب" پکارتا ہے —

مشرقی دروازے سے جہانگیر، ارجمند بانو اور ممتاز بانو لوٹتے ہیں

جہانگیر "کیا ہوا ابا جان کو" کہہ کر باپ پر جھک جاتا ہے — ارجمند بانو "ابا حضور — ابا جان" کہہ کر باپ سے چمٹ جاتی ہے — باپ کا جسم بے حس و حرکت ہے — ممتاز بانو بھی باپ پر جھک گئی ہے — دونوں لڑکیاں زار و قطار رو رہی ہیں — مغربی دروازے پر زور زور سے دستک

ہوتی ہے ــــ لڑکیوں کی چیخوں میں کڑکتی ہوئی آواز آتی ہے ـــ "دروازہ کھولو"
فیروز جاکر دروازہ کھول دیتا ہے ـــ بنک کا مینجر اندر آتا ہے۔ دروازے
پر ہی کھڑے ہو کر کہتا ہے)

بنک کا مینجر: (آواز بھاری) تم لوگ ابھی تک یہیں ہو ـــ سارا سامان نہیں گیا
ـــ حویلی نیلام ہو چکی ہے ـــ نیا مالک آرہا ہے ـــ

(سب کو پریشان دیکھ کر)

ارے یہ کیا ـــ (آگے بڑھ کر شہزادہ صاحب کی لاش دیکھتا ہے) بڑے میاں کو
کیا ہو گیا ہے ـــ ارے اس نے تو زہر کھا لیا ہے ـــ رنگ نیلا پڑ گیا
ہے، پولیس کو اطلاع کر دو۔

(بنک کا مینجر جلدی سے دروازے کی طرف جاتا ہے۔ ارجمند بانو اور ممتاز بانو
زار و قطار رو رہی ہیں۔ جہانگیر کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے ہیں۔

اسی حالت میں پردہ گرتا ہے)

زینت

افرادِ تمثیل

حمیدہ

زینت

افضل

آمال

منظر

(ایک عام کمرہ نہ زیادہ بڑا نہ خاص طور پر چھوٹا۔ اوسط درجے کا سمجھنا چاہیے سامنے مینٹل پیس پر ایک فٹ بال، ایک ریکیٹ، ایک ربڑ کی گیند، ایک چینی کا ہاتھی، ایک چابی پر چلنے والی موٹر، اور ایک منہ سے بجانے والا باجا۔ اور ان کھلونوں کے درمیان ایک خوبصورت فریم میں لگی ہوئی ساڑھے تین، چار سال کے بچے کی تصویر۔ تصویر سے کچھ اوپر، دیوار کے ساتھ ایک کلاک جس کی مسلسل ٹک ٹک پہلے دو تین منٹ کمرے کی سوگوار فضا کو سوگوار تر بنائے رکھتی ہے۔ اس وقت بارہ بجنے میں کچھ منٹ باقی ہیں۔

مغربی دیوار کے پاس ایک پلنگ جس پر اجلا بستر بچھا ہے۔ پلنگ کی پائنتی کے پاس، دیوار میں ایک الماری اور سرہانے کی طرف ایک کھڑکی جس کا ایک پٹ کھلا ہے۔ اسی دیوار میں کونے کے قریب ایک دروازہ جس کے دونوں پٹ بند ہیں۔ دوسرا دروازہ مشرقی دیوار میں ہے جس کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ آنے جانے کے لیے عموماً یہی دروازہ کام میں لایا جاتا ہے۔

کمرے کے درمیان دو بید کی کرسیاں ۔ ایک دوسری کے بالمقابل اور دونوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ۔ ان کے پاس ایک چھوٹی گول میز جس پر ہلکے نیلے رنگ کا میز پوش پڑا ہے۔ جب کردار اسٹیج پر آتے ہیں تو ان کے لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کے وقت موسمِ گرما کا کوئی مہینہ گزر رہا ہے۔ عورتوں کا لباس قمیص، شلوار اور دوپٹہ ہے، اماں نے سویٹر بھی پہن رکھا ہے۔ افضل جب اسٹیج پر آئے گا تو سیاہ رنگ کی اچکن اور شلوار میں ملبوس نظر آئے گا۔ سر پر چاکلیٹ رنگ کی جناح کیپ ہوگی۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے۔ دروازے میں سے حمیدہ داخل ہوکر آنے لگتی ہے۔ عمر بائیس تئیس برس کے لگ بھگ، دُبلی پتلی، وہ مینٹل پیس کے پاس پہنچ کر دو تین لمحوں کے لیے رُک جاتی ہے۔ اپنا ہاتھ تصویر کی طرف بڑھاتی ہے تصویر اٹھا کر الماری کی طرف جاتی ہے۔ ایک پٹ کھولتی ہے۔ تصویر اس میں رکھ دیتی ہے۔ پھر مینٹل پیس کی طرف آتی ہے۔ فٹ بال، ریکٹ اور ربڑ کی گیند اٹھا لیتی ہے۔ پلٹ کر الماری کی طرف دیکھتی ہوئی دو قدم اٹھاتی ہے۔ زینت آتی ہے زینت پینتیس برس کی عورت ہے۔ چھریرا بدن، چہرہ سنجیدہ جو ظاہر کرتا ہے کہ زیادہ تر خاموش رہنا پسند کرتی ہے۔ زینت آگے بڑھ کر حمیدہ کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور نفی میں سر ہلانے لگتی ہے۔ حمیدہ کے ہاتھ سے کھلونے لیکر پھر وہیں مینٹل پیس پر رکھ دیتی ہے۔ حمیدہ جا کر الماری کا پٹ بند کرکے چٹخنی

لگا دیتی ہے۔

اماں آتی ہے کمزور، ضعیف اور رعشے کی مریضہ۔ حمیدہ الماری سے ہٹ کر اماں کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے ۔ اماں نفی میں سر ہلاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ "مجھے سہارے کی ضرورت نہیں۔ اماں آگے بڑھ کر مینٹل پیس پر نظر ڈالتی ہے۔ مڑ کر حمیدہ کو دیکھتی ہے)

اماں: تصویر ہٹا لی تم لوگوں نے۔ پر اس کے دل سے کون تصویر ہٹائے گا بولو؟

حمیدہ: کیا بولوں اماں؟

اماں: دروازے پر قدم رکھتے ہی پوچھے گا "اکو بیٹا! کہاں ہو" ۔ اور جب اسے اکو بیٹا کہیں نظر نہیں آئے گا۔ تب کیا ہوگا؟

(حمیدہ منہ دوسری طرف پھیر کر جلدی سے دوپٹے کے دامن سے آنسو پونچھتی ہے)

حمیدہ: اللہ کی مرضی اماں ۔ مجبور انسان کیا کر سکتا ہے؟

اماں: پھر اب کیا ہوگا؟

حمیدہ: ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ شہر کے بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو بلایا۔ روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ سارے کا سارا سرمایہ لٹا دیا پر اللہ کو منظور ہی نہیں تھا۔ اکو چلا گیا۔

امّاں: اکّو چلا گیا (لمبی آہ بھرتی ہے اور آنکھیں بند کر لیتی ہے) اکّو چلا گیا — اور اب میرے بچّے کا کیا ہو گا؟

(حمیدہ پھر آنسو خشک کرنے لگتی ہے)

زینت: امّاں جان

(امّاں آنکھیں بند کئے کھڑی ہے)

امّاں جی!

امّاں: زینت! تم میرے بیٹے کو نہیں جانتیں۔

زینت: آپ بالکل دُرست فرماتی ہیں — ماں سے بڑھ کر اپنے بیٹے کو اور کون سمجھ سکتا ہے؟

(جب امّاں آنکھیں کھولتی ہے تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ زینت اپنے دوپٹے کے پلّو سے اُس کے آنسو خشک کرنے لگتی ہے۔ امّاں اس کا ہاتھ ہٹا دیتی ہے)

امّاں: اپنے بیٹے کا دُکھ میں ہی جان سکتی ہوں — اور کون جان سکتا ہے؟

حمیدہ: امّاں! زخم آخر بھر ہی جاتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی کم صدمہ نہیں ہے دیکھتے ہی دیکھتے گھر کی رونق ختم ہو گئی — یہ دُکھ تو سہنا ہی پڑے گا۔ زندہ جو رہنا ہے امّاں جان!

امّاں: تم بھی اپنے بھائی کو نہیں سمجھتیں — میرا لال جب اکّو کو کچھ دیر کے لیے

اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں دیکھتا تھا تو کس طرح بے تاب ہو جاتا تھا ــــ اس دن یاد ہے اکّو کھیلتے کھیلتے کہیں انور کے گھر چلا گیا تھا ــــ تو وہ دیوانوں کی طرح کس طرح سارے محلے میں اکّو اکّو کہتا پھرتا تھا اور جب انور اسے لے کر آیا تھا تب جان میں جان آئی تھی میرے بیٹے کی ــــ اور اکّو کو چھوڑ کر وہ اتنی دُور جاتا کب تھا۔ انور کے ابّا نے کہا۔ اکّو کو اچھی طرح پڑھانے لکھانے کے لیے بہت سا روپیہ چاہیے ــــ اور میرا افضل کہنے لگا، میں اکّو کو جب بڑا ہوگا تو ولایت بھی بھیجوں گا اور وہ روپیہ کمانے کے لیے ہزاروں میل دُور چلا گیا ــــ اور ــــ اب ــــ

حمیدہ : اماں جان صبر کرو (زینت سے) بھابی! (اس انداز سے دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو۔ اماں کو تسلّی دو نا)

زینت : اماں! بیٹھ جائیں۔ آپ بہت کمزور ہیں (ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کرتی ہے۔) ۔ بیمار بھی ہیں۔

امّاں : (زینت کا ہاتھ ہٹاتی ہے) نہیں ــــ مجھے چھوڑ دو ــــ

زینت : بیٹھ جائیں امّاں جان! ــــ خدانخواستہ کہیں چوٹ لگ جائے گی۔

امّاں : (زینت کی بات نظر انداز کرتے ہوئے) آج وہ آ رہا ہے ــــ پورے ڈھائی سال بعد ــــ اتنی لمبی مدت کے بعد ــــ یہ لمبی مدّت اس نے کس بے قراری سے کاٹی ہے۔ اس کے ایک ایک خط کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہوتا ہے

— ہر خط میں لکھتا تھا " دیکھنا میرے اکّو کو کوئی تکلیف نہ ہو ۔ اس کے کپڑوں کا خاص خیال رکھنا ۔ آج کل بڑی سردی ہو گی ۔ کوٹ پہنائے بغیر اسے گھر سے باہر نہ جانے دینا اور رات کو اپنی اماں کے ساتھ سویا کرے — اپنی اماں کے ساتھ ۔

زینت : اماں ! جب میں نے ، حمیدہ نے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے یہ صدمہ سہ لیا ہے تو وہ کیوں نہیں سہ سکیں گے اماں !

اماں : یہی تو میں کہتی ہوں — تم اس کے دکھ کا اندازہ نہیں کر سکتیں ۔ وہ تو اپنے بچے کو دیکھ کر جیتا تھا اور جب اسے بچہ دکھائی نہیں دے گا تو اسے کچھ سوجھ ہی نہیں سکے گا — وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکے گا — اس کے چاروں طرف اندھیرا چھا جائے گا ۔

(اماں کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے ہیں)

زینت : (اماں کو سنبھالتے ہوئے) اماں جان !

اماں : اللہ ۔ تو اکّو کی بجائے مجھ بڑھیا کو اٹھا لیتا تو — تیرا کیا بگڑ جاتا ۔ میرے بیٹے کی جان پر تو نہ بنتی ۔

حمیدہ : بھابی !

(اماں کھانسنے لگتی ہے)

زینت : دوا پی لی تھی اماں آپ نے ۔ صبح کے وقت ۔ کیوں جی ؟

(حمیدہ کی طرف دیکھتی ہے)

حمیدہ: نہیں۔ رات کو بھی نہیں پی، چار چار گھنٹے بعد پلانی تھی۔

زینت: رات میں نے پلا دی تھی۔

حمیدہ: دو مرتبہ؟

زینت: ہاں۔

اماں: تمھیں دوا پلانے کی فکر پڑی ہے — اور یہ خیال نہیں کہ آنے والے کا کیا ہوگا۔ یہ سوچ سوچ کر میرا دل ڈوبا جاتا ہے کہ وہ کس طرح یہ صدمہ سہہ سکے گا۔ کیا حال ہوگا اس کا پندرہ سال تک اس نے اس بچے کا انتظار کیا تھا۔ اور جب اکّو اس گھر میں آگیا تھا تو اسے گویا ساری دنیا مل گئی تھی۔ ذرا بھی اسے سُست دیکھتا تھا تو بے تاب ہو جاتا تھا جیسے اس کے دل میں سُوئی چبھو دی گئی ہو جیسے اس کے کلیجے پر کسی نے ہاتھ ڈال دیا ہو۔ ہاں وہ زمانہ کتنا نازک تھا جب اکّو کو چیچک نکل آئی تھی۔ ساری ساری رات جاگتا رہتا تھا — دن میں دو دو مرتبہ ڈاکٹر بلا کر لاتا تھا — کون باپ اپنے بیٹے سے اتنی محبت کرے گا۔ اس کی جان اکّو میں تھی۔ اکّو اس کی زندگی بن گیا تھا — اس کی روح بن چکا تھا!

(کلاک بارہ بجاتا ہے، ماں خاموش ہو جاتی ہے)

حمیدہ: بارہ بج گئے ہیں۔

اماں : (پیشانی پر دائیں ہاتھ کا سایہ کر کے) کیا وقت ہوا ہے حمیدہ؟

حمیدہ : بارہ - اماں جان!

اماں : بارہ بج گئے ۔۔ اس نے کیا لکھا تھا ۔ لکھا تھا بارہ بجے تک آجاؤں گا ۔۔ اس وقت وہ بڑے بازار میں ہوگا ۔۔ نئے نئے کپڑے اٹھائے، نئے نئے کھلونے لئے، گھر کی طرف جلدی جلدی آرہا ہوگا۔ تاکہ آتے ہی سب کچھ اپنے بچّے کے سامنے رکھ دے اور کہے "اکو! دیکھو بیٹا! میں تمہارے لیے کیا کچھ لایا ہوں - تم خوش ہونا بیٹا!"

(اماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے)

اور جب وہ آوازوں پہ آوازیں دے گا اور بچّے کی صورت اسے کہیں بھی نظر نہیں آئے گی تو ۔۔ تو؟

حمیدہ : اماں جان!

(حمیدہ خود بھی رونے لگتی ہے ۔۔ زینت اپنے دوپٹے کے پلّو سے اس کے آنسو پونچھنے لگتی ہے)

زینت : حمی بہن! تم تو صبر کرنے والی لڑکی ہو۔

حمیدہ : اماں ۔۔ (کچھ کہ نہیں سکتی)

زینت : حمی بہن! تم اماں کو دوا پلا دو ۔۔ دوا اماں کے سرہانے جو الماری ہے اس میں پڑی ہے (اماں سے) اماں! حمی کے ساتھ چلی جائیں ۔۔ ادھر ابّے نے

کمرے میں۔

اماں : دوا پینے ؟

زینت : پی لیجئے اماں!

حمیدہ : تم ہی پلا دو بھابی! لے آتی ہوں!

زینت : نہیں — دوا پی کر اماں کو لیٹ جانا چاہیے۔ اپنی چارپائی پر لیٹ جائیں گی وہاں۔

(زینت حمیدہ کی طرف اس انداز سے دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو — "اماں کو لے جاؤ")

حمیدہ : اماں! چل کر دوائی لو۔

اماں : تم لوگ چاہتے ہو کہ میں یہاں ٹھہروں بھی نہ — اچھا — پر آ رہا ہے وہ

زینت : وہ نہیں آئیں گے ابھی۔ آپ دوائی لیں اور لیٹ جائیں۔

اماں : زینو! تمھیں کوئی فکر ہی نہیں — کوئی خیال ہی نہیں۔

زینت : اماں جان! اکو کے ابا یہ دکھ سہہ لیں گے۔ میں جانتی ہوں یہ بات۔

اماں : کیسے ؟

زینت : میں جانتی جو ہوں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا — آپ جائیں۔

(زینت اماں کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف لے جانے لگتی ہے۔ حمیدہ آگے بڑھتی ہے تو اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیتی ہے۔ زینت اور اماں دونوں

کمرے سے نکل جاتی ہیں۔ حمیدہ دو تین لمحے وہاں کھڑی رہتی ہے ۔۔۔ پھر مینٹل پیس سے کھلونے اٹھا کر الماری کی طرف آتی ہے الماری کا پٹ کھولتی ہے ۔۔۔ کچھ کھلونے اس میں رکھ دیتی ہے ۔۔۔ پھر جا کر بقیہ کھلونے بھی لے آتی ہے اور انہیں بھی الماری میں بند کر دیتی ہے ۔۔۔ زینت واپس آتی ہے)

حمیدہ : اماں نے دوا پی لی؟

زینت : نہیں میں نے چارپائی پر لٹا دیا ہے ۔۔۔ کچھ دیر تو ضرور لیٹی رہیں گی۔

حمیدہ : آ جائیں گی ابھی۔

زینت : میں نے تسلّی دی ہے شاید نہ آئیں۔

حمیدہ : تسلّی سے کیا ہو گا۔ بڑھاپے میں یہ دکھ (آہ بھر کر) بدقسمت ہے میری ماں۔

زینت : زندگی میں اس سے بھی بڑے دکھ سہنا پڑتے ہیں (مینٹل پیس کی طرف دیکھ کر) کھلونے اکٹھے کے اٹھا لیے سب کے سب؟

حمیدہ : ہاں۔

زینت : رہنے دیتیں۔ یہ کھلونے اسے بہت عزیز تھے۔

حمیدہ : نہیں بھابی! اماں دیکھتی ہے تو بہت بے چین ہو جاتی ہے ۔۔۔ اور پھر بھائی جان ۔۔۔

(دونوں تین چار لمحے تک خاموش رہتی ہیں۔ زینت الماری کی طرف دیکھتی رہتی ہے)

زینت : ممی!

حمیدہ : ہاں بھابی!

زینت : تمھارے بھائی جان یہ صدمہ سہہ لیں گے۔ صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔

حمیدہ : کس چیز کی؟

زینت : جب تمھارے بھائی جان آئیں تو اماں انھیں نظر نہ آئیں۔ صرف تھوڑی دیر کے لیے۔

حمیدہ : کیونکر سمجھاؤ گی انھیں؟

زینت : (حمیدہ کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے) ایسا کر سکتی ہو تم کہ ادھر ہی اماں کو روکے رکھو ادھر نہ آنے دو۔ انھیں معلوم نہ ہونے پائے کہ تمھارے بھائی جان آ گئے ہیں۔

(حمیدہ سوچنے لگتی ہے)

جلدی بتاؤ — وقت بہت کم ہے — تمھارے بھائی جان آ رہے ہیں —
اماں بھی بے تاب ہو کر آ جائیں گی ادھر۔

حمیدہ : مجھے تو کچھ سوجھتا نہیں۔

زینت : تم صرف یہی کام کرو — اماں کو ادھر روکے رکھو۔ میں انھیں (مشرقی دروازے کی طرف اشارہ کر کے) اس دروازے سے لے آؤں گی۔ اب تم جاؤ۔

حمیدہ : اماں رکیں گی نہیں۔

زینت : جب تک روک سکو — روکو۔

حمیدہ : اچھا۔

زینت : میں (مغربی دروازے کی طرف اشارہ کرکے) دروازہ بند کرلوں گی۔چند منٹ کے لیے۔اب تم جاؤ۔

(حمیدہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔زینت مغربی دروازہ بند کرلیتی ہے۔مشرقی دروازے کا ایک پٹ کھول دیتی ہے ــ کھڑکی میں سے باہر دیکھتی ہے ــ پھر پلیٹ کر الماری کے پاس جاتی ہے ــ بڑی آہستہ سے اس کا ایک پٹ کھولتی ہے ــ ایک دو لمحے کے لیے وہاں کھڑی رہتی ہے ــ پھر کھڑکی کے پاس آتی ہے ــ اس میں سے باہر دیکھتی ہے ــ اس کے بعد جلدی سے مشرقی دروازے سے باہر نکل جاتی ہے ــ اب سٹیج خالی ہے ــ چند لمحوں کے بعد زینت واپس آتی ہے۔اس کے پیچھے افضل آتا ہے ــ اس نے ایک ہاتھ میں اٹیچی کیس اور دوسرے میں بکس اٹھا رکھا ہے۔کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ادھر اُدھر بے تابی کے عالم میں دیکھتا ہے اٹیچی کیس اور بکس فرش پر رکھ دیتا ہے)

افضل : اکو کہاں ہے ــ اماں اور حمیدہ کدھر ہیں؟

(مغربی دروازے کی طرف جانے لگتا ہے)

زینت : ٹھہرو تو!

افضل : کیا؟ اکو کہیں نظر نہیں آتا ــ میرا خط ملا نہیں تھا؟

زینت : مل گیا تھا۔

افضل : تو اکو — اور (بیوی کے چہرے کو دیکھ کر) بات کیا ہے۔ مجھے اس دروازے سے کیوں لائی ہو؟

(حیرت اور پریشانی سے بیوی کو دیکھنے لگتا ہے)

زینت : میری بات سنو!

افضل : کہو

زینت : اکو کو بلانا چاہتے ہو — وہ نہیں آئے گا۔

افضل : کہاں بھیج دیا ہے اسے آج؟

زینت : وہ کبھی نہیں آئے گا۔

افضل : (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بیوی کو دیکھتے ہوئے) کیا؟

زینت : خدا کے لیے خود کو سنبھالو۔ وہ اب واپس نہیں آسکتا۔ تمہارے آنے سے صرف دو دن پہلے وہ اس جگہ چلا گیا ہے۔ جہاں سے کوئی شخص لوٹ کر نہیں آسکتا — وہ نہیں آسکتا مگر تم اماں کو جانے سے روک سکتے ہو — اس صدمے نے نڈھال کر دیا ہے انھیں — ہم نے یہ صدمہ سہہ لیا ہے — تم یہ صدمہ سہہ لوگے مگر تمھاری ماں — اسے میں اور حمیدہ صبر کی تلقین نہیں کر سکتیں۔ یہ فرض صرف تم ادا کر سکتے ہو — اپنی ماں کو صرف تم بچا سکتے ہو۔

افضل : اکو —

زینت : (جلدی سے) جو چلا گیا اسے دنیا کی کوئی طاقت واپس نہیں لا سکتی مگر جو شخص

ابھی اس دُنیا میں ہے ــــ اس کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے ــــ جب تم اپنی ضعیف ماں کا سر اپنے سینے سے لگا کر کہو گے " اماں تمہارا پوتا چلا گیا ــــ مگر میں تمہارا بیٹا تو زندہ ہوں ــــ " یہ لفظ سُن کر اُس میں زندہ رہنے کی خواہش جی اُٹھے گی اور اگر تم خود نڈھال ہو گئے تو پھر وہ کس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو سکے گی ــــ کون اس کا سہارا بنے گا ــــ بیٹے سے بڑھ کر ماں کا اور کون سہارا ہو سکتا ہے ؟

(افضل اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا ہے)

تم جانتے ہو تمہاری اماں نے کتنے دُکھ اٹھائے ہیں ــــ وہ یہ صدمہ نہیں سہہ سکے گی ــــ مردانہ ہمت سے کام لو ۔ تمہاری ہمت کی اس وقت تم سے زیادہ تمہاری ماں کو ضرورت ہے ۔ یہی ہمت اس کے بوڑھے جسم میں زندگی کی رَو دوڑا دے گی ــــ اس کے لیے زندہ رہنے کا آسرا بن جائے گی ۔

(مغربی دروازہ پر دستک)

دیکھو تمہاری اماں آگئی ہیں ــــ تم وہی کرنا جو ایک باہمت بیٹے کو کرنا چاہیے ــــ میں دروازہ کھولے دیتی ہوں ۔

(افضل دروازے کی طرف جانے لگتا ہے ۔ زینت جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتی ہے ۔ دروازے پر اماں آتی ہے ــــ افضل ماں کو سینے سے لگا لیتا ہے)

افضل : اماں جان ! ــــ میری اماں !

(حمیدہ پاس آکر کھڑی ہو جاتی ہے)

حمیدہ : بھائی جان!

(رونے لگتی ہے)

افضل : رو نہیں حمی! یہ صدمہ ہمیں سہنا ہی پڑے گا — وہ چلا گیا۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔
— اب کیا ہو سکتا ہے رونے سے

(اماں اس کے سینے سے سر لگا کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

اتنی نڈھال کیوں ہو گئی ہو اماں!

زینت : اماں بیمار رہیں۔

(اماں افضل کی طرف دیکھ رہی ہے)

اب آپ آ گئے ہیں تو ان کی ڈھارس بندھ لیجئے — زندگی میں دُکھ آتے ہی رہتے ہیں — اور انسان ہی انھیں سہتا ہے۔

اماں : افضل — تم — بیٹا۔

افضل : اماں!

اماں : تم نے سُن لیا وہ — اکو۔

افضل : میں نے سُن لیا ہے۔ اکو چلا گیا ہے — یہ بہت بڑا دُکھ ہے — لیکن سہنا ہے اماں جان! خدا کو یہی منظور تھا اب صبر کرنا چاہیے ہمیں۔

(اماں اثبات میں سر ہلاتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ افضل کی

آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگتے ہیں چند لمحے خاموشی رہتی ہے)

زینت: حمی!

حمیدہ: جی بھابی!

زینت: تمہارے بھائی جان تھک کر چُور چُور ہو گئے ہیں۔ چائے بن گئی ہو گی۔ امجد بنا رہا تھا (افضل سے مخاطب ہو کر) آپ اماں کو دوا ضرور پلا دیں میں نہیں پلا سکی۔

(حمیدہ دروازے سے نکل جاتی ہے — افضل ماں کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگتا ہے۔ زینت ان کے جانے کے بعد دو تین لمحے دروازے میں کھڑی رہتی ہے۔ پھر کمرے میں آتی ہے الماری کھولتی ہے — کھلونے اٹھا کر انھیں مینٹل پیس پر رکھنے لگتی ہے۔ پھر تصویر اٹھاتی ہے — اس کی طرف دیکھتی ہے — اور زار و قطار رونے لگتی ہے۔ اس کے ہونٹ جنبش کرتے ہیں مگر کوئی لفظ سنائی نہیں دیتا۔ پھر وہ تصویر کو دونوں بازوؤں کی گرفت میں لے کر چہرے سے لگا لیتی ہے — حمیدہ آتی ہے — بڑی حیرت سے یہ منظر دیکھتی ہے — زینت کو اس کی آمد کی خبر نہیں ہے — حمیدہ آگے بڑھتی ہے — اور آگے بڑھتی ہے اور زینت کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

حمیدہ: بھابی! تم بھی رو رہی ہو!

(زینت آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی ہے — زبان سے کچھ نہیں کہتی اور اسی عالم میں پردہ گرتا ہے)

نئی ہمسائی

افرادِ تمثیل

زینت

رشیدہ

جمیلہ

نگہت

رقیہ

اور

ایک لڑکی

منظر

رشیدہ کے مکان کا صحن —

(صحن میں دھوپ پھیلی ہے۔ دس گیارہ کا عالم ہوگا۔ ایک طرف ایک پلنگ بچھا ہے جس کی پائنتی کی طرف رشیدہ بیٹھی سلائیوں سے سوئٹر بُن رہی ہے، عمر اٹھائیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے پاس زینت بیٹھی ہے، زینت کی عمر پچیس برس کے قریب ہوگی، اس وقت وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف نظر آتی ہے۔

چند لمحے دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول رہتی ہیں۔ زینت کتاب سے نظریں ہٹا کر رشیدہ کو ایک خاص انداز میں دیکھنے لگتی ہے)

زینت: تو آپا!

رشیدہ: ہوں۔

زینت: میں کہتی ہوں یہ بھید کیا ہے آخر؟

رشیدہ: پھر وہی بات!

زینت: آپا! کچھ معلوم بھی تو ہو۔ تم سب کچھ جانتی ہو مگر بتاتیں نہیں۔

رشیدہ : (مُسکراتی ہے) جانتی تو ہوں۔

زینت : تو (رازدارانہ انداز میں) بتاؤ نا

رشیدہ : ذرا یہ تو معلوم ہو، آخر تمھیں اُس سے اتنی دل چسپی کیوں ہے ؟

زینت : دل چسپی ؟ کیسی دل چسپی ؟

رشیدہ : عام عورتوں کی طرح وہ بھی ایک عورت ہے۔ ہماری طرح رہتی ہے۔ ہماری طرح کھاتی ہے۔ بس !

زینت : مجھے بنا رہی ہو آپا !

رشیدہ : اونھوں

زینت : کیا بات ہوئی یہ۔ عام عورتوں کی طرح ایک عورت ہے۔ اگر وہ ایسی ہی ہوتی تو میں پوچھتی کیوں بھلا۔ معاملہ تو یہ ہے کہ وہ بڑی عجیب و غریب نظر آتی ہے چھ ماہ ہوئے اس مکان میں آئے ہوئے۔ لیکن کیا مجال، جو کسی سے ایک لفظ بھی کہا ہو اُس نے۔

رشیدہ : پھر کیا ہوا !

زینت : گویا کچھ ہوا ہی نہیں ؟ ہونھ !

رشیدہ : بات صرف اتنی ہے کہ وہ کچھ ڈرتی ہے میل ملاپ کرنے سے۔

زینت : کیوں ؟

رشیدہ : کیوں ! (مُسکراتی ہے) یہی تو اصل قصہ ہے ڈرتی ہے اس طرح شاید بھید

کھل جائے گا۔

زینت : (اور قریب آکر) یہی تو میں بھی پوچھتی ہوں۔ یہ بھید کیا ہے؟ جانتی ہو آپا سب کچھ پر بتاتی نہیں ہو!

رشیدہ : میں نے کب کہا یہ بھید مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہے اور خوب معلوم ہے پرسُن کر کرو گی کیا؟ یہی سمجھ لو بعض عورتوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمسایوں سے کم بولتی ہیں اور بعض تو بولتی ہی نہیں۔ یہ تمھاری ہمسائی انھیں عورتوں میں سے ایک ہے۔

زینت : (روٹھ جانے کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے) نہ بتاؤ آپا!

رشیدہ : اچھا بابا سُن لو (سرگوشی کے انداز میں) یہ محبت کا کرشمہ ہے۔

زینت : محبت کا کرشمہ!

رشیدہ : بچپن میں اسے کسی سے محبّت تھی ـــ بڑی گہری محبت ـ دونوں ایک ہی جگہ کھیلتے تھے۔ ایک ہی جگہ پڑھتے تھے۔ رشتہ دار تھے ناں۔ خیال تھا ہمیشہ ساتھ رہیں گے اور دنیا کو اپنے لیے جنّت بنا لیں گے (آہ بھر کر) محبت کے خواب دیکھنے والے یہی بات سوچا کرتے ہیں مگر دنیا والے سخت سنگدل ہیں، کسی کی محبت پروان چڑھتے دیکھ نہیں سکتے۔

زینت : آپا تم نے تو افسانہ سنانا شروع کر دیا۔ سمجھ لیا ان میں محبت تھی۔ آگے کہو کچھ۔

رشیدہ: (آہ بھر کر) محبت تھی ان بے چاروں میں۔

زینت: باتی ہوا ہو گی اور ضرور ہو گی۔

رشیدہ: یہ بے صبری مجھے پسند نہیں!

زینت: ہائے اللہ! تم تو ناراض ہی ہو گئیں (منانے کے انداز میں) میری اچھی آپا!

رشیدہ: تمہیں کیا خبر محبت کیا ہوتی ہے؟ وہی جانتا ہے جس کے دل میں یہ آگ بھڑک چکی ہو۔ خیر ان دونوں کو آپس میں بڑی گہری محبت تھی مگر اس عورت کی شادی کہیں اور ہو گئی۔

زینت: اس ہمسائی کی شادی؟

رشیدہ: اور کس کی بات کر رہی ہوں؟ (آہ بھر کر) محبت کا زخم کبھی مندمل نہیں ہوتا۔ بیچاری اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بسر کر رہی تھی کہ ایک دن ایک خط آیا۔ یہ اس کے محبوب کا خط تھا۔ بدقسمتی سے یہ خط اس کے شوہر نے دیکھ لیا۔ تعلقات میں تلخی پیدا ہو گئی۔ شوہر سے الگ ہو گئی ۔۔۔ بس الگ ہو گئی اور ۔۔۔

زینت: اور اب یہاں رہتی ہے۔

رشیدہ: اور کیا؟ یہ راز اپنے تک ہی رکھنا۔ سن لیا۔ کسی کا بھید دوسروں کو کیوں بتایا جائے۔ بے چاری دکھی ہے۔ لوگ خواہ مخواہ باتیں بنائیں گے۔

زینت: اچھا آپا!

(جمیلہ آتی ہے زینت کی ہم عمر ہو گی۔ ہاتھ میں اون اور سلائیاں ہیں۔ زینت کو

پاس آکر بیٹھ جاتی ہے)

آؤ جمیلہ! اتنی جلدی آگئی ہو۔ بھائی جان آگئے کیا؟

جمیلہ: صبح ناشتہ کر کے چلے گئے تھے۔ عموماً ایک بجے کھانا کھانے آتے ہیں مگر آج نہیں آئیں گے۔ میں نے کہا چلو رشیدہ آپا کے پاس جائیں دھوپ میں بیٹھیں۔

رشیدہ: میں ذرا نیچے دیکھ آؤں۔ شاید وہ آگئے ہیں۔

(رشیدہ اٹھ کر چلی جاتی ہے)

زینت: (رازدارانہ لہجے میں) آج بھید معلوم ہوا نئی ہمسائی کا!

جمیلہ: اچھا۔ بتاؤ تو۔

زینت: بتاؤ گی تو نہیں کسی کو۔ آپا رشیدہ سے پکا وعدہ کیا ہے کہ میں کسی کو بتاؤں گی نہیں۔

جمیلہ: میں کیوں بتانے لگی کسی کو۔ پاگل ہو گئی ہو کیا! میری عادت جانتی ہو۔ سینہ سمندر ہے میرا۔ جو کچھ ڈالو غرق۔

زینت: جو کچھ ڈالو غرق (مسکرا کر جمیلہ کی طرف دیکھتی ہے) خوب!

جمیلہ: مذاق نہ سمجھو زینت! سچ کہتی ہوں۔ مجھے تو لگائی بجھائی کرنے والوں سے سخت نفرت ہے۔ اپنا تو کام یہ ہے کہ سب کی سنو اور بھول جاؤ۔

زینت: بات یہ ہے ہماری یہ نئی ہمسائی جو ایک معمّا بنی ہوئی ہے۔ محبت کی زخم رسیدہ

ہے۔ بچپن میں کسی سے محبت ہو گئی تھی مگر وہاں شادی نہ ہو سکی۔

جمیلہ: (مسکرا کر) پھر؟

زینت: مسکرا کیوں رہی ہو؟

جمیلہ: تم بتاتی جاؤ . . . . واقعہ شاید یہ ہوگا کہ ایک دن اُس کے محبوب کا خط آیا ہوگا اور اُس کے شوہر نے . . . .

زینت: رشیدہ آپا تو کہتی تھی کہ یہ بھید کسی کو معلوم ہی نہیں!

جمیلہ: دیکھ لو . . . ہمیں پہلے ہی سے معلوم ہے سب کچھ۔

زینت: تم نے کسی سے یہ حادثہ سُن لیا ہوگا۔

جمیلہ: اگر یہ حادثہ نئی ہمسائی کے متعلق ہے تو غلط ہے۔

زینت: نئی ہمسائی کے متعلق نہیں تو اور کس کے متعلق ہوگا؟

جمیلہ: کسی سے کہو گی تو نہیں؟

زینت: واہ میں کیوں کہوں گی!

جمیلہ: (بڑی رازداری سے) یہ اس کا اپنا قصّہ ہے

زینت: رشیدہ آپا کا اپنا؟

جمیلہ: ہاں۔

زینت: ہائے . . . میں خود حیران تھی یہ محترمہ بار بار آہیں کیوں بھر رہی ہیں۔

جمیلہ: اب سُنو!

زینت : کیا؟

جمیلہ : مجھے بھید معلوم ہے . . . نئی ہمسائی کا۔

زینت : کیا؟

جمیلہ : معمولی سی بات ہے۔

زینت : ہوں (بڑے اشتیاق سے) بتاؤ نا جمیلہ!

جمیلہ : اسے بچپن میں ایکٹرس بننے کا شوق تھا۔ بڑی ہوئی تو یہی شوق لے کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ دن بھر فلم کمپنیوں میں ماری ماری پھرتی ہے اور رات کو آ کر سو جاتی ہے۔ کسی کو اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ ایکٹرس ہے۔ کسی کو بھید معلوم نہ ہو جائے۔ اس لیے سب سے الگ تھلگ رہتی ہے۔

زینت : تمھیں یہ کیونکر معلوم ہوا؟

جمیلہ : ایسی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔

زینت : عجیب معاملہ ہے۔ ایکٹرس بننے کا شوق مجھے بھی کسی زمانے میں تھا۔ یہ بچپن کا قصّہ ہے۔

جمیلہ : شوق تو مجھے بھی بڑا تھا اور جوانی تک رہا۔ گھر والوں سے چھپ چھپ کر فلمی رسالے پڑھا کرتی تھی۔ کیا کہوں تم سے تنہائی میں کیا کچھ سوچا کرتی تھی . . . . (آہ بھر کر) سوچا کرتی تھی کہ اگر مجھے سکرین پر آنے کا موقعہ مل جائے تو کمال کر دکھاؤں گی۔

زینت: (مسکرا کر) اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(نگہت آتی ہے۔ نگہت بائیس تئیس برس کی خوش وضع عورت ہے۔ وہ پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

نگہت: ارے میں نے کہا زینت!

زینت: کیا ہے؟

نگہت: کیا باتیں ہو رہی ہیں جمیلہ سے۔ آپا کہاں ہے؟

زینت: آپا ذرا نیچے گئی ہے اور جمیلہ سے اس وقت بڑی خاص باتیں ہو رہی تھیں۔

نگہت: ہو رہی تھیں۔ ہو نہیں رہیں؟

زینت: جمیلہ کو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکی ہے۔

نگہت: نئی ہمسائی والا قصہ تو نہیں چل رہا تھا۔ سچ کہو!

جمیلہ: اس میں کیا شک ہے؟

نگہت: پتہ نہیں تو نے کیا بتایا ہے زینت کو۔ مگر جو بات میں نے معلوم کی ہے وہ غلط ثابت ہو ہی نہیں سکتی اور غلط ہو بھی کیوں؟

زینت: کیا ہے؟

نگہت: گویا بتا ہی دوں؟

زینت: بتاؤ گی کیوں نہیں؟

نگہت: اصل بھید معلوم ہو گیا ہے۔

جمیلہ : واقعی بتاؤ نا !

نگہت : روز سوچتی تھی کسی طرح یہ بھید معلوم کر لوں۔ کوئی تجویز سوجھتی ہی نہیں تھی۔ کل اس کی نوکرانی بازار سے مچھلی خرید کر لا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی میں جھانک کر بلا لیا اُسے اور اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کر بھید معلوم کرنے کی کوشش کی . . اُس نے صاف صاف تو نہیں بتایا . . . . پر . . . میں نے جو نتیجہ نکالا۔ وہ غلط نہیں ہے۔

زینت : کیا ہے نتیجہ ؟

نگہت : سچی بات یہ ہے کہ بتاتے ہوئے ڈر آتا ہے۔ کسی کی عزت کا سوال ہے۔

(رشیدہ واپس آ کر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے)

جمیلہ : رشیدہ آپا ! سُنو نگہت نئی ہمسائی کا بھید معلوم کر کے آئی ہے۔

رشیدہ : ابھی تو بھئی عزت کا سوال درپیش ہے۔

(سب ہنستی ہیں)

زینت : بتاؤ نا ؟

نگہت : یہاں غیر کون ہے ؟

رشیدہ : ہاں کوئی حرج نہیں۔ اپنی اپنی سمجھ کا معاملہ ہے . . . !

(ایک لڑکی آتی ہے)

لڑکی : (نگہت سے) باجی ! آ گئے ہیں بھائی جان۔ کہتے ہیں جلدی آؤ۔

نگہت : آتی ہوں۔ تم جاؤ!
لڑکی : جلدی آجائیے باجی! کہتے ہیں میرا نیا سوٹ نکالیں آکر۔
نگہت : سُن لیا ہے۔ ایک منٹ میں آتی ہوں۔ چلو تم۔

(لڑکی چلی جاتی ہے)

زینت : لو نگہت! اب تو تمھاری بہن چلی گئی ہے۔
نگہت : (سرگوشی کے انداز میں) کسی کے ساتھ چلی گئی تھی مگر وہ جانے اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے۔ اب بیچاری تنہا زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔
زینت : گزارہ کیوں کر ہوتا ہے؟
نگہت : زیور بیچ کر گزارہ کر رہی ہے اور کیا کر سکتی ہے؟ جب سب کچھ ختم ہو جائے گا تو ایکٹرس بن جائے گی۔ یا شاید واپس چلی جائے۔ ہمیں کیا پتہ کیا کرے گی۔ لو بھئی (اٹھ بیٹھتی ہے) میں تو چلی۔ شاید آؤں ان کے چلے جانے کے بعد۔

(نگہت چلی جاتی ہے)

رشیدہ : (مسکرا کر) توبہ
زینت : توبہ کیسی آپا!
رشیدہ : سمجھتی ہے جیسے کسی کو معلوم ہی نہیں، لیکن ایسی باتیں کبھی چھپی نہیں رہ سکتیں۔ کسی کو پتہ ہو نہ ہو۔ ہمیں تو خبر ہے۔

جمیلہ: الٰہی خیر! کس بات کا پتہ آپا!

رشیدہ: بچاری نئی ہمسائی پر الزام لگا رہی ہے۔ سچ ہے آئینے میں اپنی شکل ہی دکھائی دیتی ہے!

جمیلہ: ذرا کھل کر کہو آپا! بھلا ہم جاہل کیا جانیں۔

رشیدہ: ہم کیوں دوسروں کا بھید کھولیں۔ چُپ رہنا ہی بہتر ہے مگر چالاکی کی داد دیتی ہوں۔ کس صفائی سے اپنا الزام نئی ہمسائی پر لگا دیا ہے۔

زینت: یہ پہیلی نہیں بوجھی جاتی ہم سے آپا۔

رشیدہ: اسے اپنے تک رکھنا۔ کہیں سر پھٹول نہ ہو جائے۔ مجھے اس کی ایک پُرانی سہیلی نے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں گھر سے چلی گئی تھیں محترمہ۔

زینت اور جمیلہ: (ایک ساتھ) اچھا!

رشیدہ: لیکن حالات بگڑے نہیں۔ باپ نے جلدی شادی کر دی۔ دیکھو تو بظاہر کتنی مسکین نظر آتی ہے۔ ہے ناں!

زینت: (مایوسی سے) وہ معمّا تو حل نہیں ہوا۔

رشیدہ: (زینت کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر) حل ہو چکا ہے اور چاہتی کیا ہو؟

زینت: منہ نہ کھلواؤ رشیدہ آپا۔

رشیدہ: کیا مطلب؟

(نگہت آتی ہے)

جمیلہ : چلے گئے بھائی جان، نگہت!

نگہت : چلے جائیں گے ابھی۔

(رقیہ آتی ہے)

زینت : آؤ رقیہ! بس تمہاری کسر تھی۔

جمیلہ : معلوم ہوتا ہے کوئی بڑی عجیب و غریب بات — سنانے آئی ہے اور سنانے کے لیے بیتاب ہے۔

رقیہ : (مسکرا کر) آج ان محترمہ کے حالات معلوم ہو گئے ہیں۔

زینت : (بے چینی سے) نئی ہمسائی کے حالات؟

رقیہ : اور کیا؟

زینت : کہو تو!

رقیہ : معاملہ اصل میں یہ تھا کہ اس کا شوہر کسی مقدمہ میں گرفتار ہو کر جیل جا چکا ہے۔ اس نے اپنے والدین اور سسرال پر بار بننا گوارا نہ کیا۔ کسی دفتر میں ملازمت کرنے لگی۔ عزیزوں نے سخت مخالفت کی تو اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آگئی۔ اب ملازمت کرتی ہے۔ بس یہ بات ہے — سنا ہے تعلقات پھر خوشگوار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آج —

زینت : کیا خوب (بے اختیار ہنس پڑتی ہے)

رقیہ : اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟

زینت : (زیادہ ہنس کر) اور کیا کیا جائے ؟

(رقیہ، زینت کو گھور کر دیکھتی ہے۔ باقی عورتیں دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی ہیں)

رقیہ : عجب بھونڈا مذاق ہے !

زینت : رقیہ بہن! کہیں تم پر تو یہ افتاد نہیں پڑی۔ ہمارے بھائی صاحب خیریت سے ہیں نا۔ میرا مطلب ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جیل —

رقیہ : میں کہتی ہوں دماغ تو نہیں چل گیا تمھارا۔ چپ رہو ہمارے منہ میں بھی زبان ہے۔

نگہت : تو رقیہ بہن! کسی دفتر میں ملازمت کرنے کا ارادہ ہے۔ مالی حالت کمزور ہے۔

رقیہ : رشیدہ آپا! یہ تو پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہے۔

نگہت : رقیہ، ہاں یاد آیا۔ اس کیس کا کیا بنا۔ تمھارے شوہر پر رشوت کا الزام لگایا گیا تھا۔

رقیہ : سب بکواس، جھوٹ، بہتان۔

زینت : ویسے ہماری رقیہ بہن تعلیم یافتہ ہیں — دفتر میں ملازمت کر سکتی ہیں۔

رقیہ : تم پاگل ہو گئی ہو زینت، بالکل پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔

زینت : میں پاگلوں کی سی باتیں کر رہی ہوں — یہ بھی خوب رہی — اور تم کون ہو — تم سب کی سب اپنی نئی ہمسائی کی شکل میں اپنا ماضی دیکھ رہی ہو — اپنے اندیشوں کی پرچھائیں محسوس کر رہی ہو۔ تمھارا ماضی ابھی تک تمھارے ارد گرد منڈلا رہا ہے۔ تمھارے اندیشے دھواں بن کر تمھارے دماغوں پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس عورت کو تم نے ایک معمہ بنا دیا ہے — جب تک میں خود جا کر اس کی

باتیں سُن نہیں لوں گی۔ چین سے نہیں بیٹھوں گی ۔۔ تم نے میرا اضطراب بڑھا دیا ہے ۔۔ میری بے چینی دوگنی کر دی ہے۔ میں خود اس کے پاس جاتی ہوں اور اُس کی زبانی اس کے حالات سنتی ہوں، کون روک سکتا ہے مجھے ۔۔ کون روکے گا مجھے!

(زینت اُٹھ کر جانے لگتی ہے)

نگہت اور جمیلہ: (ایک ساتھ) زینت!

زینت: میں ضرور جاؤں گی!

نگہت: تم سچ مچ پاگل ہو گئی ہو۔

رقیہ: جانے دو اسے ۔۔ جائے گی کہاں!

زینت: کیوں۔ میں جا رہی ہوں۔ ابھی اسی وقت، اسی لمحے جا رہی ہوں۔

رقیہ: وہ خیر سے چلی گئی ہے گھر چھوڑ کر ۔۔ جاؤ ۔۔ شوق سے جاؤ۔

(زینت کے قدم رُک جاتے ہیں اور پردہ تیزی سے گرتا ہے)

بارش

افرادِ تمثیل

اجمل

فرحت

حشمت

خالہ جان

منظر

(اجمل کا سٹڈی روم۔ اوسط درجے کا کمرہ۔ فرش پر دری۔ سامنے والی دیوار پر کلاک۔ کلاک کے دائیں بائیں دو بڑی بڑی تصویریں۔ دوسری دونوں دیواروں پر بھی تصویریں۔ سامنے میز جس پر کتابیں بکھری ہوئی۔ کچھ دُور ہٹ کر ایک صوفہ سیٹ، تین کرسیاں، ایک تپائی اور ایک بک شیلف۔

آنے جانے کے لیے صرف ایک دروازہ جو ـــــ بائیں دیوار میں کھلتا ہے اور جس پر ایک رنگین پردہ لٹک رہا ہے۔

سامنے والی دیوار پر لگا ہُوا کلاک دن کے دو بجے کا اعلان کر رہا ہے۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے ہم کمرے میں میز کے پاس اجمل کو کھڑے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اجمل لمبے قد اور چھریرے بدن کا نوجوان ہے۔ بال بکھرے ہوئے، آنکھوں پر عینک، پتلون، قمیص اور سویٹر میں ملبوس۔ عمر چھبیس ستائیس برس کے لگ بھگ، سگریٹ کے کش لے رہا ہے اور نگاہیں ایک طرف میز پر جمی ہیں۔ ابھی سگریٹ نصف کے قریب ختم ہُوا ہے کہ اُسے ایش ٹرے میں دبا کے نیا سگریٹ

سُلگانے لگتا ہے۔

فرحت آتی ہے۔ اجمل سے کچھ چھوٹی۔ قمیص، شلوار اور دوپٹے میں ملبوس۔ اجمل کو اس کی آمد کی قطعاً کوئی خبر نہیں ہوتی۔ بدستور نگاہیں جھکائے، سگرٹ کے کش لگا رہا ہے۔ فرحت آگے بڑھ کر غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہے اور اس کے قریب تر ہو جاتی ہے۔ اجمل کی نظر بہن پر پڑتی ہے۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتا ہے اور پھر اسے ہونٹوں سے ہٹا کر ایش ٹرے کے اُوپر رکھ دیتا ہے۔

اجمل : کیا ہے فرحت!

فرحت : میں نے کہا بھائی جان! (اس انداز سے دیکھتی ہے جیسے پوچھ رہی ہو بھائی جان! آپ نے یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے) قصّہ کیا ہے؟

اجمل : (اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے) ہوں۔

فرحت : سب لوگ اُدھر بیٹھے ہیں۔

اجمل : تو۔

فرحت : آپ بھی اُدھر چل کر بیٹھئے ہمارے ساتھ۔ امّی خالہ کے پاس۔

اجمل : اچھا بیٹھ جاؤں گا۔

فرحت : چلئے نا پھر۔

اجمل : تم جاؤ۔

فرحت: آپ یہیں کھڑے رہیں گے؟

اجمل: پریشان نہ کرو فرحت! آخر یہاں ٹھہرنے میں کیا حرج ہے؟

فرحت: (نگاہیں جھکا کر) بھائی جان! میں جانتی ہوں آپ کو بڑا صدمہ پہنچا ہے بھابی جان کا ہمیشہ کے لیے دُنیا سے رخصت ہو جانا کوئی معمولی حادثہ نہیں۔ پر یہ صدمہ برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ صبر کرنا ہی پڑے گا!

اجمل: ہوں (گویا یہ بات مجھے معلوم نہیں)

فرحت: آپ کچھ زیادہ ہی محسوس کر رہے ہیں اس صدمے کو۔ کل سارا دن یہیں رہے ہیں۔ رات کھانا بھی یہیں منگوا لیا تھا اور اب دن کے دو بج گئے ہیں۔

اجمل: ذرا تنہائی میں بیٹھنے کو جی چاہتا ہے اور کوئی بات نہیں!

فرحت: مگر انسان کو ہر وقت ہی تنہائی نہیں چاہیے۔ بھلا کون آپ کی حالت سمجھ نہیں سکے گا۔ بال بکھرے ہیں۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سُرخ ہیں اور خدا جانے سگرٹ کی کتنی ڈبیاں پھونک ڈالی ہیں۔

(ایش ٹرے کی طرف دیکھتی ہیں)

اجمل: تم جاؤ فرحت! میں ابھی ادھر آجاؤں گا!

فرحت: خالہ ماں ہیں مرنے والی کی۔ مگر ایسی حالت اُن کی نہیں۔

(اجمل سگریٹ اٹھا کر پینے لگتا ہے)

اجمل: تو اب چاہتی کیا ہو؟

فرحت: بھائی جان!

اجمل: کہو۔

فرحت: آپ کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔ میں جانتی ہوں۔

اجمل: جانتی ہو تو پھر پوچھتی کیوں ہو؟

فرحت: میں کہتی ہوں بھائی جان صدمہ تو ہونا ہی چاہیے — مگر آپ کچھ پریشان بھی نظر آتے ہیں۔

اجمل: بہت پریشان نظر آتا ہوں؟

فرحت: ہاں۔ رات شاید ایک لمحہ بھی نہیں سو سکے۔

اجمل: یہ تم سے کس نے کہا؟

فرحت: میں نے خود آپ کو دیکھا تھا خالہ جان نے پانی مانگا تھا۔ پانی لانے کے لیے باہر نکلی تو آپ کے کمرے میں روشنی دیکھی۔ ادھر آئی تو آپ یہیں کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔ خدا کے لیے بھائی جان! اس قدر غم نہ کیجیے۔ پہلے ہی کہاں آپ بڑے صحت مند ہیں۔

اجمل: (متاثر ہو کر) سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا فرحت!

فرحت: دیکھئے نا بھائی جان! آپ پہلے شخص نہیں ہیں جسے اس قسم کا صدمہ پہنچا ہے۔ دُنیا میں یہ حادثہ ہوتا ہی رہتا ہے اور ہوتا رہے گا ہمیشہ!

اجمل: یہ بات مجھے سمجھاؤ گی!

فرحت: آپ سب کچھ جانتے ہیں۔ آپ کو بھلا کیا سمجھاؤں گی۔ پھر بھی یوں نڈھال اور پریشان ہیں۔ یہی تو سخت افسوس ناک بات ہے۔

اجمل: (سگرٹ کا لمبا کش لے کر) فرحت! تم نہیں جانتیں۔

فرحت: کہئے نا بھائی جان!

اجمل: میری پریشانی کی ایک وجہ ہے۔

فرحت: ضرور ہو گی۔

اجمل: رہ رہ کر ایک خیال ستا رہا ہے مجھے۔

فرحت: کون سا خیال؟

اجمل: کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں مگر میرے لیے نہ جانے کیوں اتنی اہم بن گئی ہے۔

فرحت: بتائیے نا بھائی جان!

اجمل: ثریا کو تو تم جانتی ہو نا۔ میرے ساتھ وہ پڑھتی رہی ہے اور اس کے ساتھ میرے تعلقات ہمیشہ بڑے خوشگوار رہے ہیں۔

فرحت: تو اس سے آپ کی پریشانی کو کیا واسطہ؟

اجمل: لوگوں کا خیال تھا وہی اس گھر میں آئے گی!

فرحت: ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کی بجائے نجمی آگئی۔

اجمل: ممکن ہے اس کا ثریا کو افسوس ہوا ہو مگر اس نے کبھی کنایتہً بھی اس کی شکایت نہیں کی اور نہ میں نے کبھی اس سلسلے میں اس سے کچھ کہا ہے۔ ہمارے تعلقات

ہمیشہ خوشگوار رہے ہیں۔

فرحت: قصہ کیا ہے بھائی جان!

اجمل: نجمی نے نہ جانے کس خوفناک وہم کو دل میں چھپائے رکھا تھا۔

فرحت: چھپائے رکھا تھا تو پھر آپ کو کیونکر معلوم ہو گیا؟

اجمل: میں سمجھتا ہوں وہ ہمیشہ بدظن رہی اگرچہ یہ چیز زبان پر کبھی نہیں لائی۔

فرحت: میں ابھی تک کچھ سمجھ نہیں سکی بھائی جان!

اجمل: مجھے بھی کچھ معلوم نہ ہوتا — مگر ایک شام کا واقعہ ہے۔ میں نے نجمی سے کہا نجمی! آج ثریا کی سالگرہ ہے۔ اُس نے ہم دونوں کو کھانے پر بلایا ہے۔ نجمی کہنے لگی — میرے سر میں درد ہے۔ آپ چلے جائیں — خیر میں چلا گیا جیسے ہی ثریا کے یہاں پہنچا۔ موسلادھار بارش ہونے لگی۔ بارہ بجے کے قریب ثریا کا بھائی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا کر یہاں چھوڑ گیا۔

فرحت: پھر؟

اجمل: میں اندر آیا تو نجمی دروازے کے پاس کھڑی تھی۔ خوفزدہ سہمی سہمی۔ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ میں نے حالت پوچھی تو کہنے لگی۔ کچھ نہیں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ چائے پی لیجیے۔ یہ کہہ کر وہ چائے بنانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ میرے پلنگ کے پاس کوئلوں سے بھری ہوئی انگیٹھی بھی پڑی ہے۔ حیران ہو گیا بھلا اس قدر اہتمام کی کیا ضرورت تھی — پھر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ میں بھی سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بارش پھر تیز ہو گئی اور دروازے کے دونوں پٹ زور سے ٹکرائے وہ چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی۔ میں نے اسے تھاما۔ وہ بیہوش تھی یا نیم بیہوش۔ کہہ نہیں سکتا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھی۔ سنگدل۔ مجرم۔

فرحت: سنگدل۔ مجرم۔

اجمل: میں نے یہی الفاظ سنے اور ان لفظوں کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے امی امی کہتی ہوئی آواز نکلی جیسے بچہ تکلیف میں ماں کو پکارتا ہے۔ میں نے اسے بستر پر لٹا دیا کچھ دیر بعد اسے ہوش آیا۔ اس وقت تو میں خاموش رہا۔ صبح یہ واقعہ دہرایا تو اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہہ دیا "ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ یہ محض آپ کا وہم ہے"۔ عجیب عورت تھی۔ دل کی بات زبان پر لاتی ہی نہیں تھی۔

فرحت: آپ کا مطلب ہے وہ آپ سے بدظن تھی۔

اجمل: یہ حادثہ تو یہی بتا رہا ہے۔

فرحت: بھائی جان آپ نجمی کو سمجھا دیتے۔ اسے اپنے اور ثریا کے تعلقات کی نوعیت بھی بتا دیتے۔

اجمل: میں نے جب بھی ذکر کیا اُس نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔

فرحت: تو پھر یہ آپ کا محض وہم ہے۔

اجمل: یہ وہم ہے یا کچھ اور۔ اس کا فیصلہ تو نجمی ہی کر سکتی تھی اور اس نے کبھی فیصلہ نہیں

کیا۔ ہوش و حواس کی حالت میں۔ ایک اور بات بھی ہے۔

فرحت: کیا؟

اجمل: آج سے پندرہ دن پہلے کا واقعہ ہے۔ رات کے وقت نجمی کے کمرے میں امّی سو رہی تھیں میری آنکھ کھلی تو میں یہ دیکھنے کے لیے کہ نجمی کو وقت پر دوا ملی ہے یا نہیں۔ اُس کے کمرے میں گیا۔ اس وقت (ذرا رک کر) میں نے دیکھا کہ نجمی کسی کاغذ پر جھکی ہوئی ہے اور تیزی سے کچھ لکھ رہی ہے۔ میرے قدموں کی آہٹ سنتے ہی اس نے کاغذ چھپا لیا اور غصے سے کہنے لگی۔ آپ جا کر سو رہیے۔ اس طرح میری فکر نہ کریں مہربانی کر کے۔ میں خاموش رہا اور کمرے سے نکل آیا۔

فرحت: آپ کو معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ کیا لکھ رہی تھی۔

اجمل: بالکل نہیں۔ میں نے اس کی تحریر کو بہتیرا ڈھونڈا کہیں نہیں ملی پھر میں نے زیبو سے پوچھا تو نے نجمی سے کوئی خط لے کر پوسٹ تو نہیں کیا تھا۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی۔ پھر کہنے لگی۔ ہاں میں نے خطوں والے ڈبے میں ایک خط ڈالا تھا

فرحت: زیبو جاہل ہے اسے کیا معلوم، خط پر پتہ کس کا درج تھا۔

اجمل: ظاہر ہے۔

فرحت: تو بھائی جان!۔۔۔ آپ سمجھتے نہیں۔ اس نے ثریا کو خط لکھ دیا ہوگا۔

اجمل: کیا خبر۔ کتنا بُرا اثر پڑے گا اور کیا ہوگا۔ اس کا انجام۔ اگر اس کے بھائی نے یہ خط دیکھ لیا یا شوہر نے تو۔

فرحت: آپ ثریا سے ملے؟

اجمل: وہ آج کل یہاں ہے کہاں۔ نجمی کی موت سے چند ہفتے پہلے ہی کراچی چلی گئی تھی۔
یہاں ہوتی تو نجمی کے انتقال پر ضرور آتی۔

(دونوں دو تین لمحے خاموش رہتے ہیں خالہ جان آتی ہیں۔ بوڑھی عورت، لباس عام مگر دوپٹے کی بجائے گرم چادر اوڑھے ہوئے۔ خالہ جان کو آتے دیکھ کر اجمل اس کی طرف بڑھتا ہے اور فرحت بھی قدم اٹھانے لگتی ہے۔ دونوں اس کے پاس جاکر ٹھہر جاتے ہیں)

فرحت: آیئے خالہ جان۔

خالہ جان: فرحت بیٹی! میرا سویٹر شاید تیری الماری میں ہے۔ اپنی باجی کو دے دے جاکر۔

فرحت: کیوں خالہ جان!

خالہ جان: میری چیزیں سنبھال رہی ہے تمھاری باجی۔

فرحت: میں سویٹر ڈھونڈ لیتی ہوں۔ مگر آپ جائیں گی نہیں ابھی۔

(فرحت کمرے سے نکل جاتی ہے)

اجمل: خالہ جان آپ کو جانا نہیں چاہیے۔

خالہ جان: جاؤں گی بیٹا۔ دس دن سے یہاں بیٹھی ہوں۔

اجمل: یہ آپ کا اپنا گھر نہیں؟

خالہ جان: (آنسو پونچھتے ہوئے) اپنا گھر ہے بیٹا!

اجمل: پھر چند مہینے یہیں رہیئے — گھر میں کون ہے آپ کا صرف بوڑھی نند اور کون ہے؟

خالہ جان: اللہ تمھیں خوش رکھے مجھے اب جانا ہی چاہیے بیٹا!
اجمل: مگر کیوں خالہ جان! آپ کی طبیعت خراب ہے۔ یہاں بہتر تیمارداری ہو سکے گی۔
خالہ جان: اب میری تیمارداری کیا ہوگی (لمبی آہ بھر کر) اب مجھے تیمارداری کی کیا ضرورت ہے
نہ رہی میری بچّی۔

(چادر سے آنسو پونچھتی ہے۔ خاموشی میں تین چار لمحے گزر جاتے ہیں)

اجمل: اللہ کو یہی منظور تھا۔
خالہ جان: کتنی نیک بچّی۔ کتنی باحیا، کم گو۔ اپنی ماں سے بھی کھل کر بات نہیں کہتی تھی۔
اجمل: مرنے والی میں لاکھوں خوبیاں تھیں۔

(حشمت آتی ہے۔ بہن بھائی کی طرح لمبے قد اور چھریرے بدن کی عورت۔ لباس وہی
جو فرحت کا ہے۔ چُپ چاپ ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہے)

خالہ جان: تم لوگوں نے نہیں دیکھا۔ مرنے سے ایک دن پہلے میری گردن میں بانہیں ڈال کر
زار و قطار رونے لگی۔ اور کہنے لگی۔ امّی مجھے معاف کر دو۔ (خود رونے لگتی ہے) امّی!
تُو نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ میں کتنی بُری لڑکی ہوں۔ آپ خدا کے لیے مجھے معاف
کر دیں میرا قصور۔ ہائے اس کے الفاظ نشتر بن کر میرے دل میں چُبھ رہے ہیں۔ میں نے
کہا ہاں بیٹی! میں نے تجھے معاف کر دیا تو بالکل بے قصور ہے۔ سمجھتی تھی مجھے
اس کے چلے جانے سے کتنا صدمہ ہوگا۔ کتنا دُکھ ہوگا۔ معافی مانگنے لگی۔ کیا
قصور تھا میری بچّی کا۔ ہائے۔ (روتی ہے)

حشمت : صبر کیجئے خالہ جان!

خالہ جان : صبر۔ کرنا ہی پڑے گا۔ اچھا بچو! (حشمت اور اجمل کے سر پہ ہاتھ پھیرتی ہے) زیبو تانگہ لے آئی۔!

حشمت : لینے گئی ہے خالہ جان!

خالہ جان : اچھا۔ خدا حافظ۔ اللہ تم سب کو خوش رکھے۔ ہمیشہ خوش رہو۔ اللہ کو یہی منظور تھا کہ اس بھرے گھر سے میری بچی چلی جائے۔ چلی گئی۔ کون روک سکتا تھا اسے۔ اچھا اللہ کی مرضی۔

(خالہ آنسو پونچھ کر آہستہ آہستہ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے حشمت اور اجمل دونوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ خالہ جان دروازے میں سے نکل جاتی ہے۔ دو تین لمحے گزر جاتے ہیں۔ فرحت واپس آجاتی ہے)

فرحت : خالہ جان جا رہی ہیں۔

اجمل : میں نے بھی اصرار کیا۔ مگر

حشمت : ادھر امی نے بھی کئی بار کہا تھا۔ نہیں مانتیں۔

فرحت : بھائی جان! ابھی آپ نے جو کچھ کہا تھا۔ اس کا ذکر میں نے باجی سے کر دیا ہے۔

(اجمل اس کی طرف دیکھتا ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہتا)

حشمت : اور یہ فرحت تم نے بہت اچھا کیا ہے (شکایتہً) اجمل نے مجھ سے ذکر کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا۔

اجمل : کیا ذکر کرتا باجی!۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ معاملہ کیا ہے؟

حشمت : میں ایک بات جانتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہماری بھابی نہایت شریف الطبع لڑکی تھی۔

فرحت : اس میں کیا شک ہے مگر جو چیز بھائی جان کے لیے سوہان روح ثابت ہو رہی ہے اس کا کیا ہوگا! نجمی نے جو خط لکھا تھا کیا خبر وہ ثریا کو بھیج دیا ہو یا ہو سکتا ہے کسی اور کو بھیج دیا ہو۔

حشمت : کیوں ؟

فرحت : میں نے بتایا نہیں آپ کو۔ نجمی بھائی جان اور ثریا کے تعلقات سے دل ہی دل میں بدظن تھی۔

حشمت : تو اس نے ثریا کو کیا لکھا ہو گا ؟

فرحت : یہ بات آپ نہیں سمجھ سکیں۔ بھائی جان کو وہ سنگدل اور مجرم سمجھتی رہیں تو ثریا کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو گی۔ کیا کچھ نہ لکھ دیا ہو گا اس خط میں۔

اجمل : (فکرمندانہ لہجے میں) یہ خط اس کے شوہر کے ہاتھ میں بھی جا سکتا ہے اور شائد —

حشمت : ثریا کی بجائے اس کے شوہر کو خط لکھ دیا ہو گا نجمی نے ؟

اجمل : میں کیا جانوں ؟ — کیا جان سکتا ہوں ؟

(وقفہ — حشمت سر جھکا کر کچھ سوچنے لگتی ہے)

حشمت : اجمل! تم نے کہا ہے کہ ایک رات شدید بارش ہو رہی تھی اور نجمی نے بیہوشی یا نیم بیہوشی کے عالم میں تمھیں سنگدل اور مجرم کہہ دیا تھا۔

اجمل : ہاں۔

حشمت: میں سمجھتی ہوں اجمل! ممکن ہے یہ بچپن کے کسی حادثے کا نفسیاتی اثر ہو؟

اجمل: کیا مطلب؟

حشمت: تم جانتے ہو بچپن میں کبھی کبھی ایسا حادثہ بھی رونما ہو جاتا ہے جسے انسان کبھی فراموش نہیں کر سکتا اور جس کا نقش رہ رہ کر اُبھرتا رہتا ہے ہو سکتا ہے کہ اُس رات نجمی نے جو کچھ کہا ہو وہ بچپن کے کسی حادثے کا نفسیاتی ردِ عمل ہو اور اسے اس تصور سے قطعاً کوئی واسطہ نہ ہو جو تمھارے بیلے سوہان روح بنا ہوا ہے۔

اجمل: اس چیز کو بچپن کے کسی حادثے کا ردِ عمل کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا۔

حشمت: تم تو خیر اس کے شوہر تھے اجمل! ایک مرتبہ اُس کی سگی ماں کو بھی اس سے شکایت پیدا ہو گئی تھی۔

فرحت: کیا باجی!

حشمت: ہوا یہ کہ — یہ آج سے کئی سال پہلے کا قصہ ہے۔ رات بہت سرد تھی۔ بارش بھی ہو رہی تھی۔ نجمی سو رہی تھی یکایک وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی۔ ماں دوڑ کر اُس کے پاس گئی تو اُس نے ماں کا ہاتھ نفرت سے پرے ہٹا دیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگی "چلی جاؤ۔ چلی جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو" خالہ جان حیران رہ گئیں۔ صبح اٹھ کر انھوں نے سب سے پہلے نجمی سے اس بات کا ذکر کیا۔ نجمی نے اس حادثے ہی سے انکار کر دیا اور کہنے لگی۔ امی! یہ آپ نے کوئی سپنا دیکھا ہے۔ میں نے کچھ بھی نہیں کہا آپ سے — تمھیں معلوم ہے نا نجمی ماں کی کتنی فرمانبردار بیٹی تھی۔

فرحت : میرا خیال ہے اس نے ماں کی بجائے کسی اور کا ہاتھ سمجھا ہوگا۔

حشمت : کمرے میں اور کوئی تھا نہیں — اور پھر اس حادثے کے متعلق تم کیا کہوگی ؟

فرحت : کس حادثے کے متعلق ؟

حشمت : نجمی کے کمرے کی کارنس پہ خالہ جان کا فوٹو پڑا رہتا تھا۔

فرحت : میں نے کئی بار دیکھا ہے۔

حشمت : کئی بار اسے الٹا کر رکھ دیا جاتا تھا اور پھر خالہ خود اسے ٹھیک طور پر رکھا کرتی تھیں۔

فرحت : اُلٹا کر کون رکھ دیتا تھا اسے ؟

حشمت : خالہ جان خود بہت حیران ہوتی تھیں۔ ایک دن اُنھوں نے دیکھا کہ یہ کارروائی ان کی صاحبزادی سرانجام دیتی ہیں۔

فرحت : (حیرت سے) کیا ؟

حشمت : یہ کیا بات ہوئی بھلا — یہی پوچھنا چاہتی ہو نا تم ؟

فرحت : ہاں !

حشمت : میں سمجھتی ہوں یہ کسی ذہنی الجھن کا نتیجہ ہے ! تمھیں خبر نہیں کبھی کبھی نجمی عجیب باتیں کرنے لگتی تھی۔ مثلاً ایک مرتبہ شادی سے پہلے جب وہ بیمار ہوئی تھی تو اس نے ماں سے کہا تھا۔ امّی ! آپ کو نیند بہت عزیز ہے۔ خواہ کوئی نمونیے سے مر جائے آپ جاگیں گی نہیں — میرے کمرے میں حشمت آپا کو بُلا کر سلا دیا کیجیے۔ ماں نے اس بات

پر سخت شکایت کی تھی مگر بعد میں سمجھ گئی تھی کہ بخار نے ان کی بیٹی کے ذہن پر بُرا اثر ڈال دیا تھا۔ ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہو گی!

فرحت: کونسی حقیقت؟

حشمت: شاید خالہ جان نے کسی وقت نیند میں کسی کی پروا نہیں کی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ ایک رات سخت بارش ہو رہی ہو۔ نجمی جاگ کر باپ کا انتظار کر رہی ہو اور ڈر رہی ہو کہ ابّا بارش میں بھیگ جائیں گے اور نجمی کے ابّا کھانستے کھانستے گھر آئے ہوں۔ خالہ جان حسب معمول گہری نیند میں غرق ہوں۔ نجمی کے ابّا نے بار بار خالہ کو آواز دی ہو اور کہا ہو۔ میری طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے سردی لگ گئی ہے — اور خالہ نے بجائے اس کے کہ اُٹھ کر آگ جلائے اور چائے بنائے۔ نیند ہی میں مست رہی ہو۔ اور نجمی جو اُس زمانے میں بچی ہو گی۔ باپ کی حالت دیکھ دیکھ کر تڑپ رہی ہو۔ سخت بے چین ہو رہی ہو اور صبح اُٹھ کر نجمی کے ابّا کی حالت بہت خراب ہو گئی ہو اور وہ نمونیے میں مبتلا ہو کر چار روز بعد —

فرحت: خالو جان نمونیے ہی سے مرے تھے۔

اجمل: باجی! آپ تو نفسیاتی موشگافیاں لے بیٹھی ہیں خواہ مخواہ —!

حشمت: (بدستور سنجیدگی سے) اجمل یہ محض نفسیاتی موشگافیاں نہیں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے بالکل حقیقت ہے۔

اجمل: حقیقت!

حشمت: بالکل حقیقت۔ نجمی اس حادثے کے بعد اپنی ماں کو مجرم سمجھتی رہی ہے اور جب کبھی شدید بارش ہوتی تھی اسے یہ افسوسناک حادثہ یاد آجاتا تھا اور — اجمل نے جس حادثے کا ذکر کیا ہے وہ بھی اسی گہرے نقش کی ایک جھلک ہے۔

اجمل اور فرحت: (ایک ساتھ) باجی!

حشمت: میں یہ حقیقت خود نہیں کہہ رہی مرنے والی نجمی کی زبان سے کہہ رہی ہوں

اجمل: کیا!

حشمت: (قمیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ایک لفافہ نکالتے ہوئے) یہ ہے اس کا ثبوت۔ مرحومہ کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر۔

(فرحت اور اجمل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لفافہ دیکھنے لگتے ہیں)

اجمل: یہ تحریر —

حشمت: یہ وہی تحریر ہے جس کا ذکر تم نے فرحت سے کیا تھا۔ یہ خط نجمی نے ماں کو لکھا تھا اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ کچھ دن کے بعد مر جائے گی اور وہ چاہتی تھی کہ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اپنا سب سے بڑا راز ماں کو بتا دے اور اس سے معافی مانگ لے۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے۔ وہ اس خط میں درج ہے مفصل طور پر۔ نجمی ماں سے یہ باتیں نہیں کر سکتی تھی — اس کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے خط لکھ دیا اور ماں کا پتہ لکھ کر زیبو کو دیا کہ پوسٹ کر آئے۔

فرحت: آپ کے ہاتھ کیوں کر آ گیا؟

حشمت: میں نے زیبو کو اس طرح جاتے ہوئے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی جیسے چوری کر کے کچھ لے جا رہی ہو۔ میرے دل میں ایک شک سا پیدا ہوا۔ میں اسے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ میرے اصرار پر اس نے بتا دیا کہ بی بی نے یہ لفافہ پوسٹ کرنے کے لیے دیا ہے اور کہا ہے کہ کسی کو اس کا علم نہ ہو۔ میں نے لفافہ لے لیا اور اس سے کہہ دیا تم بی بی کو بتا دینا لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا ہے۔ اس کے بعد میں سوچنے لگی کہ بھابی نے اپنی ماں کو کیا لکھا ہے۔ ظاہر ہے ہمارے گھر کی بابت کچھ ہوگا۔ راز جوئی کے جذبے نے مجھے بیتاب کر دیا۔ میں جانتی ہوں میں نے ایک اخلاقی جرم کا ارتکاب کیا ہے لیکن جب میں نے تحریر پڑھی تو میرے دل میں یقین پیدا ہو گیا کہ اگر میں اخلاقی جرم نہ کرتی تو اس کا نتیجہ سخت بُرا ہوتا۔

(فرحت اور اجمل آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر حشمت کو دیکھ رہے ہیں)

کیا تم سمجھتے ہو میں نے بُرا کیا؟

فرحت: نہیں۔

حشمت: میں نے بُرا نہیں کیا۔ میں نے ایک ماں کو اُس خلش سے بچا لیا ہے جو بڑھاپے میں اُس کے لیے سوہانِ روح بن جاتی۔ ایک لڑکی ماں کی انتہائی فرمانبردار ہونے کے باوجود اسے دل میں مجرم سمجھتی رہی۔ یہ کتنا دردناک، کس قدر المناک بات ہے۔ اب مرنے والی اپنے ذہن میں یہ احساس لے کر گئی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا پہلا اور آخری راز ماں کو بتا کر ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات حاصل کر لی ہے اور ماں یہ جانتی

ہے کہ اس کی بیٹی نے زندگی کے آخری لمحوں میں جو اپنی بانہیں اس کے گلے میں ڈال کر رو رو کر معافی مانگی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتی تھی کہ اس کے چلے جانے سے ماں کو کتنا دکھ ہوگا اور وہ بالکل بے قصور ہوتے ہوئے بھی اپنے قصور کے لیے معافی چاہ رہی تھی — یہ احساس ماں کے لیے بچے دکھ کا احساس بنے گا — وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنی بچھڑی ہوئی بیٹی کی یاد میں آنسو بہایا کرے گی لیکن ان آنسوؤں میں ایک ماں کا سچا درد، سچا غم ہوگا — کوئی خلش، کوئی پچھتاوا کوئی چبھن نہیں ہوگی۔ وہ کانٹا جو اس کے بوڑھے اور ضعیف دل کو گھائل کر دیتا۔ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔

(لفافہ پھاڑ پھاڑ کر پرزے گراتی جاتی ہے۔ فرحت اور اجمل مطمئن نظروں سے اسے دیکھ رہے ہیں — پردہ گرتا ہے)

سوتیلی ماں

افرادِ تمثیل

فاطمہ	سوتیلی ماں
غفور	فاطمہ کا شوہر
مرادو	ہمسائی
رضیہ	فاطمہ کی ایک عزیزہ
مجید	فاطمہ کا بیٹا

(ایک سادہ کمرہ۔ کسی دیوار پر کوئی تصویر یا کیلنڈر نظر نہیں آتا۔ کمرے کا سامان ایک نچلے متوسط طبقے کے گھرانے کی نشان دہی کر رہا ہے۔ سامنے کی دیوار کے پاس ایک پلنگ جس کے بستر کی بے ترتیبی کا یہ عالم ہے کہ تکیہ درمیان میں پڑا ہے اور لحاف کا نصف حصہ نیچے فرش کو چھو رہا ہے۔ دائیں دیوار کے ساتھ ایک میز، جس پر کتابوں کی وہی صورت ہے جو پلنگ پر بستر کی ہے۔ میز کے قریب ایک کرسی جس کی پُشت ایک میلے پجامے سے ڈھکی ہوئی ہے اور بازو پر ایک سفید دُھلی ہوئی قمیض لٹک رہی ہے۔

دروازہ بائیں دیوار میں ہے۔ صبح کے نو بج رہے ہیں، جس وقت پردہ اٹھتا ہے ہم فاطمہ کو دیکھتے ہیں۔ فاطمہ پست قد کی عورت ہے، رنگ سیاہی مائل۔ پنجابی عورتوں کے عام لباس یعنی شلوار، قمیض اور دوپٹے میں ملبوس۔ سن چھتیس اور چالیس کے درمیان، رک رک کے بات کرنے کی عادی۔ اس وقت ٹفن کیریر میز پر رکھے اسے بند کر رہی ہے۔

دوسرے کمرے سے غفور کی آواز آتی ہے "میں نے کہا فاطمہ اب لاؤ بھی نا"۔ فاطمہ "ابھی آئی" کہہ کر ٹفن کیریر اٹھا کر دروازے کی طرف جانے لگتی ہے۔ یکایک اس کی نظر پلنگ پر پڑتی ہے۔ ٹفن کیریر وہیں فرش پر رکھ کر لحاف تہ کرنے کے بعد تکیہ اپنی جگہ پر رکھ دیتی ہے۔ اس کام

سے فارغ ہو کر ٹفن کیریر کی طرف قدم بڑھاتی ہے کہ غفور آجاتا ہے۔ غفور ایک لمبا تڑنگا آدمی ہے پجامے کے ساتھ سیاہ اچکن پہنے ہوئے۔ عمر پینتالیس کے لگ بھگ، آنکھوں پر عینک غفور خود ٹفن کیریر اٹھا لیتا ہے۔ فاطمہ مڑ کر کرسی سے پاجامہ اٹھا کر اسے دائیں کندھے پر رکھ لیتی ہے اور قمیص لے کر اس کا جائزہ لینے لگتی ہے۔

غفور: بھئی حد ہو گئی۔ مجھے دفتر سے دیر ہو رہی ہے اور یہاں ابھی تک صفائی ہی ہو رہی ہے۔

فاطمہ: صفائی کیا کروں گی۔ لحاف وغیرہ تہ کیا ہے۔

غفور: میں کہتا ہوں یہ مجید کا بچّہ خود اپنا کام کیوں نہیں کرتا۔ تم کیوں ہر وقت اس کی چیزیں ٹھیک ٹھاک کرتی رہتی ہو؟

فاطمہ: بس اب کوئی کام نہیں (قمیص کے بٹن دیکھ کر) توبہ یہ نا باں ہر بار مجید کے بٹن توڑ لاتی ہے۔ اب کے کپڑے لینے آئے تو سہی۔

غفور: اور یہ قمیص والا خود کہاں ہے؟

فاطمہ: کہہ رہا تھا کسی دوست کے ہاں سالگرہ ہے۔

غفور: سالگرہ صبح کے ساڑھے سات آٹھ بجے نہیں ہوتی۔

فاطمہ: کہیں اور گیا ہو گا پھر۔ میں نے پوچھا نہیں تھا۔

غفور: کیوں؟

فاطمہ: تم نے خود پوچھا ہوتا۔ تمھارا بھی تو کچھ فرض ہے۔ باپ ہو۔

غفور: میں نے تو چار دن سے اس کی شکل تک نہیں دیکھی۔ پوچھتا کس سے، اس کے فرشتوں سے؟

فاطمہ: آئے گا تو پوچھوں گی۔

غفور: میں کہتا ہوں یہ کم بخت کر کیا رہا ہے؟

فاطمہ: کیا کر رہا ہے۔ یُونہی بگڑ رہے ہو!

غفور: نوکری وو کری کی فکر ہے اُسے کچھ؟ بڑا بہترین چانس ہے۔ نکل گیا تو عمر بھر ہاتھ ملتا رہے گا۔

فاطمہ: سمجھا دوں گی بابا!

غفور: خاک سمجھاؤ گی (دروازے کی طرف جانے لگتا ہے پھر رُک جاتا ہے فاطمہ کی طرف مُڑتا ہے) اُسے کہ دینا آج مجھے دفتر آ کر بتائے کہ شاہ صاحب کی ہدایت پر کہاں تک عمل کیا ہے۔ نوکری کے لیے عرضی بھیج دی ہے یا نہیں۔ مجھے ضرور آ کر بتائے۔ سُن لیا تم نے؟

فاطمہ: توبہ — غصہ مجھ پر نکالا جا رہا ہے خواہ مخواہ!

غفور: تم اُس کی چہیتی ماں جو ہو۔

فاطمہ: (مسکرا کر) اچھا تو پھر۔

غفور: مجھے ضرور آ کر بتائے۔ جس وقت آئے فوراً میرے پاس بھیج دینا۔

فاطمہ: سُن لیا ہے بابا — بھیج دوں گی! بھیج دوں گی!

(غفور دروازے سے نکل جاتا ہے، فاطمہ پھر قمیص کا جائزہ لیتی ہے اور دروازے سے نکل جاتی ہے۔ چند لمحوں کے لیے سٹیج خالی رہتی ہے۔ فاطمہ واپس آتی ہے۔ اب اس کے کندھے پر میلا پچار نہیں ہے۔ ہاتھ میں قمیص اور سوئی دھاگہ ہے۔ پلنگ پر بیٹھ کر قمیص میں بٹن لگانے لگتی ہے۔ دروازے پر مرادو آتی ہے۔ مرادو کا وہی لباس ہے جو فاطمہ کا ہے۔

سن بھی قریب قریب وہی ہے۔ چھریرے بدن کی عورت ہے۔ فاطمہ قمیص سے نظر ہٹا کر اُسے دیکھتی ہے اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ مرادو آگے بڑھ کر اُس کے پاس پہنچ جاتی ہے)

مرادو : کیا ہو رہا ہے فاطمہ!

فاطمہ : بٹن لگا رہی ہوں۔ یہ نامراد تاباں ہر بار میرے مجید کی قمیصوں کے بٹن توڑ لاتی ہے۔ سخت تنگ آ گئی ہوں اس سے۔

مرادو : (فاطمہ کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیتے ہوئے) دھوبی بٹن توڑا ہی کرتے ہیں۔

فاطمہ : جی ہاں انھیں کپڑے تو دئے اسی لیے جاتے ہیں کہ تباہ کر کے رکھ دیں۔

مرادو : مجید کے ابا چلے گئے ؟

فاطمہ : ابھی ابھی گئے ہیں (ذرا سکوت) ہاں زہرہ کا کیا حال ہے ؟

مرادو : زخم تو ٹھیک ہو گیا ہے پر کمزور بہت ہو گئی ہے۔

فاطمہ : ٹھیک ہو جائے گی دو چار دن میں۔

مرادو : ڈاکٹر نے طاقت کی دوائیں لکھ دی ہیں۔ بڑی قیمتی ہیں دوائیں۔

فاطمہ : دوائیں تو قیمتی ہی ہوتی ہیں — طاقت کی دوائیں تو اور بھی قیمتی ہوتی ہیں۔

مرادو : خریدنا پڑیں گی اسی لیے تو —

فاطمہ : (کچھ بھانپ کر) آج کل بڑی بُری حالت ہے۔ ہر گھر میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ پوری تنخواہ دس بارہ دن میں ختم۔ دوا دارو کے لیے بھی پیسہ نہیں ہوتا۔ پچھلے مہینے مجھے سخت زکام ہو گیا تھا مگر۔

مرادو: (اس کی بھی بات پر پریشان ہوکر) میں ہفتہ پندرہ دن اور چُپ رہتی پر کیا کروں مجبور ہوگئی ہوں۔

فاطمہ: کیا — میں سمجھی نہیں۔

(فاطمہ بٹن لگا چکی ہے۔ اب قمیص اُلٹ پلٹ کر دیکھتی ہے کہ کہیں پھٹی ہوئی تو نہیں۔ ایک جگہ اُس کی نظر رُک جاتی ہے)

لو دیکھو اب کے پھاڑ بھی لائی ہے تا باں کی بچّی۔ (سوئی میں دھاگا ڈالتی ہے)

مرادو: (توجّہ کیے بغیر) تو میں کہہ رہی تھی۔ پندرہ بیس دن اور نہ مانگتی پر —

فاطمہ: میں نے کہا نا — ہر گھر میں یہی حالت ہے۔

مرادو: (جلدی سے) پرسوں بھی مجید سے کہہ دیا تھا بیٹا! اب سخت ضرورت آپڑی ہے۔ رقم جلدی دے دو۔

فاطمہ: (اب وہ لہجہ نہیں) کیا میرے مجید نے کچھ پیسے لیے تھے تم سے؟

مرادو: ہاں۔

فاطمہ: ایسی ضرورت کیا پڑ گئی تھی اسے۔

مرادو: ایک ہفتے کیلئے لے گیا تھا۔ تین ہفتے گزر گئے ہیں۔ پرسوں میں نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔ پیسے دے دو بھائی ورنہ — تمھارے گھر پہنچ جاؤں گی۔

فاطمہ: کتنی رقم ہے؟

مرادو: پچیس روپے

فاطمہ: کیا کروں —؟

مرادو : مجید کے ابا سے یے ڈرنا۔ اور کیا؟

فاطمہ : اس کے باپ سے تو کچھ کہو نہ میں دُ ئے دیتی ہوں۔

مرادو : فاطمہ سچ کہتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں سوتیلی مائیں جلاد ہوتی ہیں مگر تم تو سگی ماں سے بھی بڑھ کر ہو۔

فاطمہ : دُعا ہے میرا مولا مجھے کچھ کرنے کی توفیق دیتا رہے۔ میرے بچے کو کوئی دُکھ نہ ہو۔

مرادو : آمین۔ شاباش ہے بھئی اس زمانے میں ایسی مائیں کہاں ہوں گی؟

فاطمہ : اللہ نے مجھے توفیق دی اور میں نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ تم نہیں جانتیں مرادو بہن! مجید کی ماں کے مرنے کے بعد مجید کے ابا نے۔ پورے چار سال تک بیاہ نہیں کرایا ڈرتا تھا کہ سوتیلی ماں بچے پہ ظلم نہ توڑے۔ سب جانتے ہیں سوتیلی مائیں جلاد ہوتی ہیں بچوں کے حق میں۔ اور آخر جب میں یہاں آئی بیوی بن کر تو پہلے دن ہی کہنے لگا ۔۔جانتی ہو کیا کہا اُس نے؟

مرادو : کیا کہا؟

فاطمہ : یہ میرے بیاہ کے پہلے دن کی بات ہے۔ کہنے لگا دیکھو فاطمہ! میں سب کچھ برداشت کر لوں گا مگر یہ برداشت نہیں کروں گا کہ میرے بچے پہ کوئی سختی ہو اور کچھ کرو نہ کرو میرے مجیدے سے اچھا سلوک ضرور کرو۔ بس۔ اور مرادو بہن! میں نے اسی روز عہد کر لیا تھا کہ مجیدے کو ہرگز ہرگز کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گی اور زمانہ جانتا ہے کہ میں نے کس ناز و نعمت سے اس کی پرورش کی ہے۔

کبھی بھڑک تک نہیں دی اسے۔ ہر بات مانی ہے اس کی۔ اس نے دن کہا ہے تو دن سمجھا ہے۔ رات کہا ہے تو رات سمجھا ہے۔ خود تکلیفیں سہی ہیں مگر اسے کبھی تکلیف نہیں ہونے دی۔ مجید کے دل سے پوچھو کبھی نہیں کہے گا کہ یہ میری سوتیلی ماں ہے۔

مرادو: شاباش ہے تم پر۔ میں جانتی ہوں کوئی سگی ماں بھی اپنے بیٹے سے ایسا پیار نہیں کرے گی جیسا تم کرتی ہو۔

فاطمہ: اللہ کی مہربانی ہے جس نے مجھے یہ فرض ادا کرنے کی توفیق دی — اچھا آؤ پیسے دے دوں تمھیں۔

مرادو: چلو بہن۔

(دونوں دروازے سے نکل جاتی ہیں۔ چند لمحوں کے بعد فاطمہ تنہا آتی ہے اور میز کے پاس پہنچ کر کتابوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی ہے۔ باہر سے خالہ کہتی ہوئی آواز آتی ہے۔ فاطمہ "آؤ رضیہ" کہتے ہوئے ہاتھ میں کتاب پکڑے دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ رضیہ اندر آتی ہے۔ عمر بیس بائیس برس۔ دوہرا بدن، لباس عام۔ رقعے کا ادپر کا حصہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے)

فاطمہ: بھئی آج تم کیسے ٹپک پڑیں رضیہ!

رضیہ: تو چلی جاؤں خالہ!

فاطمہ: ہائے بیٹی! تم تو لڑنے کا ارادہ کر کے آئی ہو شاید۔ جاؤ کیوں تم۔ مجھے تو یہ شکایت ہے کہ مہینوں گزر جاتے ہیں اور نہ تم شکل دکھاتی ہو اور نہ تمھاری ماں۔ بیٹھو نا پلنگ پہ کھڑی کیوں ہو۔ میں ذرا کتابیں رکھ لوں۔

رضیہ : (پلنگ پر بیٹھتے ہوئے) مجید بھائی کے ابا ہیں نا گھر پر!

فاطمہ : نہیں وہ تو چلے گئے دفتر کو تھوڑی دیر ہی ہوئی ہے۔

رضیہ : ساڑھے نو بجے دفتر جایا کرتے ہیں۔

فاطمہ : آج کل نو بجے جاتے ہیں۔ کیوں کیا بات ہے؟

رضیہ : اُن سے کچھ کہنا ہے۔

فاطمہ : اُن سے کچھ کہنا ہے۔ کیا کہنا ہے؟

رضیہ : میں نے عرض کیا نا۔ انہی سے کہنے والی بات ہے۔

فاطمہ : بھئی کیا بات ہے (مسکرا کر) کیا ارادہ کر کے آئی ہو تم (پلنگ کی طرف جاتے ہوئے) کیوں رضیہ!

رضیہ : ارادہ کیا ہو گا — آپ نے تو اپنے صاحبزادے کو کھُلی چھٹی دے رکھی ہے۔

فاطمہ : یہ معاملہ ہے — لڑنے کے لیے آئی ہو اپنے بھائی سے۔

رضیہ : ان سے میرا کیا واسطہ ہیں تو خالو سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔

فاطمہ : خالو تو گھر پر نہیں — مجھے بتا دو ان کی بجائے — کیا فرق پڑتا ہے۔

رضیہ : نہیں میں انہیں سے کہوں گی۔

فاطمہ : مجھے بتانے میں کیا حرج ہے؟

رضیہ : خالہ! آپ کے صاحبزادے نے جو حرکت کی ہے وہ سخت بے جا ہے۔

فاطمہ : کیا ہے وہ حرکت بیٹی!

رضیہ: مجھے تو شرم آتی ہے بتاتے ہوئے (جیب سے ایک لفافہ نکال کر) یہ ملاحظہ فرمائیں۔

فاطمہ: یہ خط کس کا ہے؟

رضیہ: آپ کے صاحبزادے نے مجھے لکھا ہے۔۔۔ واہیات، بیہودہ کوئی شریف آدمی ایسا شرمناک خط کسی شریف لڑکی کو لکھ سکتا ہے۔ مجھے خبر ہوتی کہ حضرت اس کیریکٹر کے آدمی ہیں تو میں کبھی بات بھی نہ کرتی ان سے۔۔۔ دو تین مرتبہ آپا کے ہمراہ ان کے ساتھ سینما چلی گئی تو حضور نے سمجھ لیا جیسے میں ان کے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکوں گی۔۔۔ جھٹ قلم اٹھایا اور عاشقانہ خط لکھ دیا۔ توبہ۔

(فاطمہ خط دیکھتی ہے)

فاطمہ: اچھی حرکت نہیں کی مجید نے۔

رضیہ: ذرا سوچیے خالہ یہ واہیات خط اگر میں ابا کو دکھا دیتی تو حضرت خاندان بھر میں کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہ رہتے۔

فاطمہ: یہ تم نے اچھا کیا۔

رضیہ: ایسی حرکت کرنے کی انھوں نے جرأت کیسے کی۔ میں اس بات پر حیران ہوں؟

فاطمہ: رضیہ!

رضیہ: ہاں۔

فاطمہ: (لہجے میں منت سماجت) یہ خط مجید کے ابا کو نہ دکھاؤ۔

رضیہ: کیوں؟

فاطمہ: خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔

رضیہ: مگر خالہ ان کی یہ حرکت کتنی بیہودہ ہے۔ یہ بھی تو سوچیے ذرا۔ کوئی شریف آدمی ایسی حرکت کرے گا۔

فاطمہ: بُری حرکت کی ہے اس نے۔ بہ محض بچپنا ہے اس کا۔ مگر تم بات بڑھاؤ نہیں۔

رضیہ: بات بڑھانی ہوتی تو اپنے ابّا کے حوالے نہ کر دیتی یہ خط۔

فاطمہ: اب اس کے ابا کے حوالے بھی نہ کرو!

رضیہ: تو اور کیا کروں؟

فاطمہ: پھاڑ ڈالو۔ لاؤ مجھے دو۔ میں خود پھاڑ دیتی ہوں۔ لاؤ بیٹی!

رضیہ: انھیں سزا ضرور ملنی چاہیے۔

فاطمہ: اب کے معاف کر دو بیٹی!

رضیہ: آپ کیسی باتیں کہہ رہی ہیں خالہ!

فاطمہ: اچھی بیٹی ہو نا۔۔ ماں کا کہا مان لو۔۔ رضیہ بیٹی! میں تم سے کہہ رہی ہوں۔ تمھاری ماں کی بجائے ہی تو ہوں۔ میری بیٹی!

(فاطمہ لفافہ پھاڑنے لگتی ہے)

رضیہ: خالہ! ٹھہرو تو یہ کیا کر رہی ہو (رضیہ ہاتھ بڑھاتی ہے مگر فاطمہ کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہے) آپ نے تو کمال کر دیا ہے خالہ!

فاطمہ: آج آجانے دو اسے۔ بڑی گت بناؤں گی۔۔ پاگل ہو گیا تھا۔ کیسا بچپنا ہے۔

رضیہ : انتہا ہے پاگل پن کی ___ دیکھو خالہ! آپ ڈانٹ ڈپٹ کر انھیں سمجھا دیجیے
کہ شریفوں کے بچّے شریف ہوتے ہیں۔

فاطمہ : سمجھا دوں گی بابا! (رضیہ جانے لگتی ہے)
مگر جا کیوں رہی ہو۔ کچھ کھا پی کر جانا!

رضیہ : نہیں خالہ! پھر کبھی آؤں گی۔ آپ اُسے بڑی سختی سے منع کر دیجیے کہ آئندہ ایسی
حرکت ہرگز نہ ہو۔

فاطمہ : اچھّا۔

(رضیہ کمرے سے نکل جاتی ہے۔ فاطمہ وہیں کھڑی پیشانی پر انگلیاں پھیرنے لگتی ہے۔
جیسے کچھ پریشان ہو۔ پھر پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے مگر جلد ہی اُٹھ کر میز کے پاس جا کر کتابوں کو
دوبارہ ترتیب سے رکھنے لگتی ہے، مجید آتا ہے۔ عمر بیس بائیس کے قریب، صحت مند اور
توانا۔ پجامے، ریشمی قمیص اور واسکٹ میں ملبوس۔ گلے میں رنگین رومال بندھا ہوا۔ منہ
میں سگرٹ جسے گفتگو کرتے وقت بھی ہونٹوں سے نہیں ہٹاتا۔ باتیں کرنے کا ڈھنگ بد تمیزانہ)

مجید : ہیلو ممی!

(فاطمہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ یونہی کتابیں اُلٹ پلٹ کرتی رہتی ہے)
میں نے کہا ممی! (ماں سے لپٹ جانے کی کوشش کرتا ہے)

فاطمہ : پرے ہٹ نامراد!

مجید : (رونی صورت بنا کر) کیوں ممی! میں نے کیا کیا ہے آخر۔ آپ خفا ہو گئیں۔

فاطمہ: میں پوچھتی ہوں تُو بن کیا گیا ہے؟

مجید: میں تو آپ کا خادم ہوں ممّی!

فاطمہ: یہ لچھن اچھے نہیں تمہارے۔ ذلیل ہو جاؤ گے اور ماں کو بھی ذلیل کرواؤ گے

مجید: بات کیا ہے آج!

فاطمہ: پہلے مرادو آئی تھی۔ پھر رضیہ۔ حد ہو گئی ہے۔ تم کیسی بُری حرکتیں کرنے لگے ہو۔

مجید: ممی سچ کہتا ہوں ـــ لوگ، خواہ مخواہ مجھے بدنام کرتے رہتے ہیں۔ میں تو خدا کی قسم سچ مچ نیک آدمی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ رشتہ دار میرے دشمن کیوں ہو گئے ہیں ـــ چاہتے ہیں میں مر جاؤں۔ کہیں دفع دفان ہو جاؤں۔

(مجید یونہی انگلیوں سے آنکھیں پونچھنے لگتا ہے)

فاطمہ: ہائے روتا کیوں ہے؟

مجید: ممّی (ماں سے لپٹ جاتا ہے) میری پیاری ممّی، میری گریٹ ممّی!

فاطمہ: کسی وقت اس دوزخی لعنت کو تو منہ سے نکالا کر۔ ہر وقت سگرٹ، ہر وقت سگرٹ۔

مجید: (سگرٹ منہ سے نکال کر دُور پھینکتے ہوئے) ممی! تمہارا حکم ماننا تو میرا مذہب ہے۔ اب کہو کوئی اور حکم۔

فاطمہ: میں تم سے بیزار ہوں۔ دُور ہو جا۔

مجید: میں دُور ہو جاؤں۔ ممی، سچ مچ، اچھا میں چلا ہمیشہ کے لیے۔

(دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ فاطمہ تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے)

فاطمہ: ٹھہر نامراد۔ میں پوچھتی ہوں تم نے ایسا واہیات خط کیوں رضیہ کو لکھا تھا۔ شادی وادی کا قصہ تھا تو مجھ سے بات کی ہوتی۔ میں موقع محل دیکھ کر سلیقے سے بات کر لیتی۔

مجید: چھوڑو نا اماں اس قصے کو ـــ خاک ڈالو۔ وہ پاگل لڑکی ہے۔ احمق کہیں کی۔

فاطمہ: اگر وہ اپنے باپ کو خط دے دیتی تو کیا ہوتا۔

مجید: کیا ہوتا (ہنستا ہے) اماں تم سلامت رہو ہزار برس۔

فاطمہ: ہاں مجھے تو تُو اپنی ڈھال سمجھتا ہے اور کیا ہوں تمہارے لیے!

مجید: ممی! مجھے خدا کی قسم، مجھے اپنی قسم تم بہت گریٹ ماں ہو۔ بہت گریٹ جی چاہتا ہے ہر وقت تمہارے پاؤں چومتا رہوں۔ تم نہیں جانتیں۔ میں تمہارا کتنا احترام کرتا ہوں۔

فاطمہ: جبھی کیسی حرکتیں کرتے ہو ـــ باپ الگ نالاں ہے۔ کہہ کر گیا ہے۔ مجید کو میرے دفتر بھیج دینا۔ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔

مجید: چلا جاؤں گا اُدھر بھی۔ فی الحال تو ایک بہت بڑی اُلجھن میں گرفتار ہوں اسی لیے اپنی پیاری ماں کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں۔

فاطمہ: یہ ڈھکوسلے میں خُوب سمجھتی ہوں۔
مجید: ہائے امّی۔ تم بھی یہ کہتی ہو۔ تمھارے مُنہ سے بھی ایسی باتیں نکلتی ہیں۔ اب کہاں ہے میرا ٹھکانا۔

(بسورنے لگتا ہے)

فاطمہ: میں اب تمھارے لیے کچھ نہیں کروں گی!
مجید: اماں! تم نہیں کرو گی تو اور کون کرے گا، تم نے اب تک میری ہر بات مانی ہے۔ اب بھی مان لو۔
فاطمہ: ہرگز نہیں۔
مجید: امّاں جان!
فاطمہ: تم ملازمت کرتے ہو نہ گھر میں رہتے ہو۔
مجید: امّاں! میں سب کچھ کروں گا۔ آپ جو کچھ کہیں گی وہ کروں گا۔ بس آج میری ایک بات مان جائیں۔ آخری بار۔
فاطمہ: یہ تو تُو کئی بار کہہ چکا ہے۔ ہر بار تیری بات آخری بات ہوتی ہے۔
مجید: آج آخری بار ہے۔ بالکل سچ کہتا ہوں۔ مجھے اپنی جان کی قسم۔ اگر جھوٹ بولوں تو مجھے سانپ کاٹ کھائے۔ ہیضہ ہو جائے۔ طاعون ہو جائے۔ میرا جنازہ۔۔۔
فاطمہ: (جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر) چُپ نابکار! کیسی بُری باتیں مُنہ

سے نکالتا ہے۔

مجید: اماں تم تو میری ایسی ماں ہو ۔ کہ دُنیا میں کوئی ایسی ماں نہیں ہوگی۔ اگر آج تُو نے میری بات رد کر دی تو میں ذلیل ہو جاؤں گا۔ میری عزّت خطرے میں ہے۔

فاطمہ: وہ کیسے؟

مجید: اب کچھ کہنے سننے کا وقت نہیں اماں! ۔ اگر میں خالی ہاتھ یہاں سے چلا گیا تو سچ مچ بڑی تکلیف ہو گی۔

فاطمہ: خالی ہاتھ ۔ کیا مطلب؟ ۔ تجھے خبر نہیں کہ تیرا باپ اب مجھے ایک پیسہ تک نہیں دیتا ۔ وہ پچیس روپے جو میں نے مرادو کو دئے ہیں۔ اس سے اپنے کپڑے بنوانے کے لیے لیے تھے۔ اب انہی کپڑوں میں مرونا کاٹنا ہوگی۔

مجید: تم نہیں جانتیں اماں! میری عزّت خطرے میں ہے ۔ صرف ایک سو روپیہ۔ بس۔ پھر کبھی نہیں مانگوں گا۔ آخری سانس تک نہیں مانگوں گا پھر کبھی مانگوں تو مجھے سانپ ۔

فاطمہ: تو آج مار کھائے گا مجھ سے۔

مجید: شوق سے مار لو ۔ جتنا جی چاہے مار لو۔

(سر جھکا کر آگے بڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

فاطمہ: مجید! ایسی حرکتیں نہ کیا کر۔

مجید: بالکل نہیں کروں گا۔ بس وعدہ۔ آخری وعدہ!

فاطمہ: تو جا باپ سے مل جاکر۔

مجید: آج نہیں امّاں!

فاطمہ: پھر کب جائے گا؟

مجید: کل ضرور جاؤں گا۔

فاطمہ: پھر اب مجھ سے کیا کہتا ہے؟

مجید: صرف سَو روپے —

فاطمہ: میں کہتی ہوں — تمھیں اچھی طرح خبر ہے ساری تنخواہ تمھارا باپ اپنے پاس رکھتا ہے۔

مجید: تو — اب میں کیا کروں؟ سخت مُصیبت ہے! — امّاں تم ہی کچھ کرو!

فاطمہ: بڑی سخت ضرورت ہے؟

(وقفہ — اس دوران میں فاطمہ کچھ سوچتی رہتی ہے)

مجید: امّاں! تم سے کبھی جھوٹ بول سکتا ہوں میں؟

فاطمہ: تو یُوں کر میری سونے کی چوڑیاں —

مجید: (ماں سے بے اختیار لپٹ کر) او گریٹ ممّی! میں پہلے ہی سمجھتا تھا تُو اپنے بیٹے کی تکلیف نہیں دیکھ سکے گی۔ ماں تُو بڑی شان دار ماں ہے۔ بہت

بہت گریٹ۔

فاطمہ: چل ہٹ پرے۔ بے حیا۔

(فاطمہ دروازے سے نکل جاتی ہے — مجید بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے

اب اسٹیج خالی ہے۔ چند لمحوں کے بعد فاطمہ آتی ہے اور اپنے دوپٹے سے کرسی جھاڑنے لگتی ہے مگر اس انداز سے جیسے اس کے ذہن پر کوئی سوچ مسلّط ہو — غفور آتا ہے۔ غصّے سے چہرہ تمتمایا ہوا)

غفور: فاطمہ!

(فاطمہ اس کی طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے یک بیک چونک پڑی ہو)

فاطمہ: آج اتنی جلدی کیسے آ گئے؟

غفور: میں پوچھتا ہوں یہ ہو کیا رہا ہے؟

فاطمہ: ہائے اللہ! کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ دفتر سے چھٹی ہو گئی ہے۔ قصہ کیا ہے؟ اطمینان سے کہو۔

غفور: ہاں اطمینان ہی سے تو کہوں گا۔ اب تک سب کچھ اطمینان ہی سے تو ہوتا رہا ہے۔

فاطمہ: کیا ہوتا رہا ہے — کیا ہو گیا ہے؟

غفور: تمھارا بیٹا شرابی — جواری بن چکا ہے — سُنا تم نے — آج میرے دوستوں نے مجھے بتایا ہے۔ وہ اس وقت بھی قمار خانے میں ہے۔

فاطمہ : (چونک کر) کیا؟

(فاطمہ غفور کی طرف آنے لگتی ہے)

غفور : شرابی — جواری — میں نے ہزار بار کہا اسے روکو — اسے ڈانٹو — اس کے نخرے نہ اٹھاؤ — اسے کھلی چھٹی نہ دو۔ مگر تم نے ایک نہ سُنی۔ اُس کی ساری ذمہ داری تم پر ہے۔ تم نے اسے بگاڑا ہے — آخر سوتیلی ماں ہونا۔

فاطمہ : (آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے) میں سوتیلی ماں — سو— تے — لی — ماں۔

(آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شوہر کو دیکھنے لگتی ہے اور اس کے ساتھ پردہ بھی جلدی سے گرتا ہے)

؛

پرچھائیں

افرادِ تمثیل

فوزیہ	ناصر کی بیوی
ناہید	فوزیہ کی سہیلی
ناصر	فوزیہ کا شوہر
حسنی	خادمہ

(عام کمروں سے نسبتاً بڑا کمرہ۔ اچھا خاصا سجا سجایا، فرش پر بیش قیمت قالین، دیواروں پر رنگا رنگ تصویریں، ایک طرف صوفہ سیٹ، کرسیاں، تپائی، میز، سب کچھ قرینے سے رکھا ہوا۔ مشرقی دیوار کے ساتھ تپائی کے اوپر گراموفون، اسی دیوار میں گراموفون کے پاس کمرے میں آنے جانے کے لئے ایک دروازہ، جس میں ہلکے نیلے رنگ کا پردہ پھیلا ہوا، شمالی دیوار میں ایک کھڑکی، دونوں پٹ کھلے ہوئے۔ پس منظر میں صاف طور پر کچھ نظر نہیں آتا۔ فضا ابر آلود، پانی کی جھلملاتی ہوئی ایک لکیر سی جو کچھ دور جا کر افق کی تاریکیوں میں گم ہو گئی ہے۔

موسم بہار کی ایک رات۔ پہلا پہر۔

جس وقت پردہ اٹھتا ہے ہم دروازے کے پاس فوزیہ اور ناہید کو دیکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے دونوں ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی ہیں۔

فوزیہ سفید براق سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ قد و قامت درمیانہ، چہرے پر ملاحت، نقش تیکھے اور گہرے، آنکھیں بڑی اور سیاہ جن میں ایک سوگواری مسکراہٹ

عموماً نمایاں رہتی ہے۔ ہونٹوں پر سُرخی کا ایک خط جو اس کے قدرتی رنگ کا جزو بن گیا ہے
کانوں میں لمبے آویزے، عمر تیس کے لگ بھگ۔

ناہید لمبے قد کی عورت۔ چہرہ فوزیہ جیسا دلکش تو نہیں مگر اس کی سادگی میں بھی ایک
حُسن ہے۔ فوزیہ کی ہم عمر، پیازی رنگ کی ساری میں ملبوس۔

فوزیہ کھڑکی کی طرف جاتی ہے، اس کے دونوں پٹ بند کر دیتی ہے۔ پھر گراموفون
کے پاس جاکر سوئیوں کی ڈبیا اٹھاتی ہے ــــ نئی سوئی نکال کر ساونڈ بکس میں لگا دیتی ہے،
ڈِسک پر ریکارڈ رکھتی ہے۔

ناہید اس کے قریب اس انداز سے کھڑی ہے جیسے اسے فوزیہ کی اس حرکت
سے کوئی دلچسپی نہیں)

ناہید: تو تم نے بتایا نہیں فوزی! اس تقریب کی وجہ کیا تھی؟

فوزیہ: تقریب کی وجہ؟ ــــ کوئی خاص نہیں۔ جی چاہا کہ اپنی سہیلیوں سے باتیں کی جائیں۔
گھر میں ذرا گہما گھمی ہو، بلا لیا تم لوگوں کو کھانے پر۔

ناہید: گویا گہما گھمی کے لئے ہم لوگوں کو بلایا گیا تھا۔!

فوزیہ: خاص وجہ نہ سہی ــــ وجہ تو ہے بہرحال۔!
لو ریکارڈ سُنو! (فوزیہ سوئی ریکارڈ پر رکھتی ہے)

(فلم "دیا پتی" کا ریکارڈ "مٹڈولے ہردے کی نیاڈولے" بجتا ہے)

ناہید: بھئی یہ ریکارڈ تو پہلے بھی سنوا چکی ہو۔

فوزیہ: اوہ ـــــ اچھا اور نکالتی ہوں۔ یہ اوپر ہی پڑا تھا ریکارڈوں کے ـــــ لگا دیا۔

ناہید: دیکھو بھئی فوزی! اس وقت میرے ہر دے کی نیا تو ساحل پر جانے کے لئے بیقرار ہے۔

فوزیہ: کیا مطلب؟

ناہید: بھئی ختم کرو یہ قصہ مجھے گھر جانا ہے۔

(فوزیہ سوئی ریکارڈ سے ہٹا دیتی ہے)

فوزیہ: رات یہاں نہیں رہو گی؟

ناہید: کیسے رہ سکتی ہوں؟

فوزیہ: ایک رات اپنے ان سے الگ رہ کر گزار لو گی تو کیا قیامت آجائے گی؟

ناہید: قیامت تو نہیں آئے گی۔ پر آجکل گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں ـــــ ایک تو وہ ملتان والی خالہ ہیں۔ مدت کے بعد آئی ہیں چند روز کے لئے۔

فوزیہ: صبح باتیں کر لینا ان سے۔

ناہید: دوسرا مہمان ان کا بڑا صاحبزادہ ہے۔ دیکھا ہو گا تم نے ـــــ دیکھا کیا ہو گا تمہارے ساتھ ہی تو کالج میں پڑھتا رہا ہے۔ اپنا سلیم ـــــــ پہلے ہی شاعر مزاج تھے یہ حضرت۔ پر آجکل کچھ زیادہ ہی شاعر مزاج ہو گئے ہیں ـــــ ان کی مہمان نوازی کا فرض میرے ذمے ہے۔

فوزیہ: کیوں؟

ناہید: گھر میں صرف میں ہی ان سے ذرا بے تکلف ہوں اور کسی کی تو سنتے ہی نہیں اپنی وحشت میں گم سم باہر گھومتے رہتے ہیں یا گھر میں چپ چاپ پڑے رہتے ہیں۔

فوزیہ: بلایا کیوں تھا انہیں؟

ناہید: عجیب بات کرتی ہو —— ماں انہیں ساتھ لائی ہیں، سمجھتی ہیں یہاں ان کا علاج ولاج ہو جائے گا —— مگر ان کی بیماری میری سمجھ میں تو آتی نہیں اور آج تو خالہ کچھ پریشان سی بیٹھی تھیں۔

فوزیہ: کیوں؟

ناہید: سلیم کہہ گیا تھا "میں واپس نہیں آؤں گا شاید" —— جب میں آنے لگی تو خالہ کہہ رہی تھیں "جانے میرا دل کیوں بُری طرح ڈوب رہا ہے —— جانے کیا ہوگا؟"

فوزیہ: تم ٹھہر جاتیں آج رات —— شاید —— پتہ نہیں تم کیوں نہیں ٹھہرتیں۔

ناہید: فوزی! میں نے کہا ایسی بات کیا ہے۔ بھائی جان کہیں باہر جا رہے ہیں کیا؟

فوزیہ: نہیں!

ناہید: پھر؟

فوزیہ: پھر؟ پھر کیا؟ کبھی کبھی گھبرا جاتی ہوں۔ ہمارا گھر ایسی جگہ ہے کہ شام سے پہلے ہی یہاں سناٹا چھا جاتا ہے۔

ناہید (کھڑکی کی طرف دیکھ کر): ہاں یہ جگہ تو مجھے بے حد پسند ہے۔ اِدھر اُدھر سبزہ،

درخت اور پھر قریب ہی دریا ——

فوزیہ : گویا تم ٹھہرو گی نہیں ؟

ناہید : (حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر) کیا اب بھی تمہیں اصرار ہے ؟

فوزیہ : اوہ نہیں —— تمہاری مرضی ۔ پھر کب آنے کا ارادہ ہے ؟

ناہید ۔ جلدی آنے کی کوشش کروں گی (رسٹ واچ دیکھ کر) تمہارے میاں ابھی تک نہیں آئے ۔ مہمان تو جا چکے ہیں ۔

فوزیہ : بلا کر لاتی ہوں جاکر ۔ خود تو وہ شاید جلدی نہیں آئیں گے ۔

(فوزیہ دروازے کی طرف جانے لگتی ہے ۔ ابھی دروازے کے قریب ہی پہنچی ہے کہ دروازے کا پردہ ہٹا کر ناصر آتا ہے ۔ ناصر پینتیس چھتیس برس کا تنومند آدمی ہے ۔ چہرے پر شگفتہ مزاجی نمایاں ، چاکلیٹ رنگ کے سوٹ میں ملبوس ۔ آتے ہی ناہید کو ذرا حیرت سے دیکھتا ہے ۔ فوزیہ واپس آجاتی ہے)

ناہید (مسکرا کر) : ناصر بھائی ! مجھے دیکھ کر آپ کچھ حیران سے ہو گئے ہیں ۔

ناصر : آپ واپس کیونکر آگئیں ؟

ناہید : میں گئی ہی کب تھی ۔ آپ نے مجھے زبیدہ کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا شاید ۔

ناصر : میں تو سمجھتا تھا آپ جا چکی ہیں ۔

فوزیہ : میں نے روک لیا تھا انہیں ۔

ناصر : یہ تو ٹھیک ہے مگر دیکھو فوزی ! آج سارا دن تم نے شاپنگ کی ہے ، دعوت کے

اہتمام میں بھی بُری طرح مصروف رہی ہو۔ اپنی سہیلی سے باتیں پھر کبھی کر لینا۔ آج جلدی

سو جانا چاہیئے تمہیں۔

ناہید: آپ اس کی فکر بالکل نہ کریں میں جا رہی ہوں۔

ناصر: کیسے؟

ناہید: آپ کی گاڑی میں بیٹھ کر

ناصر: لیکن جانے کی اب ضرورت کیا ہے سو جائیں یہیں۔

فوزیہ: انہیں جلدی گھر جانا چاہیئے۔ آپ چھوڑ آئیں۔

ناصر: مجھے اعتراض تو کوئی نہیں۔

فوزیہ: چھوڑ آئیے انھیں۔

ناہید: بھائی جان! آپ کو تکلیف تو ہوگی۔ جب فوزی نے روکا تھا مجھے تو میں نے

یہی سمجھا تھا کہ آپ لوگ شہر جا رہے ہیں مجھے ساتھ لے چلیں گے۔ بعد میں معلوم

ہوا فوزی کی نیت کچھ اور ہے۔

ناصر: کوئی بات نہیں۔ گاڑی نکالتا ہوں۔

(ناصر کمرے سے نکل جاتا ہے)

ناہید: فوزی! ایک بات کہوں؟

فوزیہ: کہو --- اجازت کیوں مانگ رہی ہو؟

ناہید: تمہارے ابا جان مرحوم کا فیصلہ بالکل درست تھا۔

(فوزیہ کوئی جواب نہیں دیتی)

ناہید: درست کہہ رہی ہوں میں ——— مجھے خوب یاد ہے۔ میں نے ہی گھر آکر تمہیں بتایا تھا کہ تمہارے ابا میاں ناصر کو تمہارا رفیقِ حیات بنانا چاہتے ہیں۔ اس وقت تم نے ذرہ برابر دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ میرا خیال ہے کہ سوگوار سی ہو گئی تھیں تم ——— میں اس کی وجہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ یقیناً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ تم نے پہلے کبھی ناصر کو دیکھا نہیں تھا!

فوزیہ: تمہیں معلوم ہے ناہید! میں ابا جان کا کس قدر احترام کرتی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی میں صرف یہی ایک بات مجھ سے کہی تھی۔ ہاں یا نہ کا لفظ میری زبان سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ خاموشی احترام کی وجہ سے تھی۔!

ناہید: اور تم نے بزبانِ خاموشی اسے مان لیا تھا۔ کاش وہ زندہ رہتے اور دیکھتے کہ ان کا فیصلہ کس قدر صحیح نکلا ہے۔

فوزیہ: تم نے اس کے متعلق کیا بتایا تھا؟

ناہید: کس کے؟ سلیم کے متعلق ———؟ یہ شاعر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

(باہر سے ہارن کی آواز آتی ہے)

لو بھئی خدا حافظ! پھر ملیں گے اگر خدا لایا۔

(ناہید اور فوزیہ دونوں دروازے کی طرف جانے لگتی ہیں)

فوزیہ: ناہی! پل والے راستے سے جانا یہ نزدیک تر ہے۔ ان سے کہہ دینا۔

ناہید: بہتر!

(ناہید دروازے پر جاکر، چیریو، کہتی ہے اور نکل جاتی ہے ۔۔۔ فوزیہ واپس آتی ہے۔ ایک لمحے کے لیئے کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے ، پھر گراموفون کی طرف جاتی ہے۔ ریکارڈ پر سوئی رکھ دیتی ہے۔ وہی ریکارڈ بجتا ہے "ڈولے ہردے کی نیا ڈولے" ۔۔۔ خود کو اس کرسی میں گرا دیتی ہے جو گراموفون کے پاس پڑی ہے۔۔ گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ نکالتی ہے۔ اس کی تہیں کھولتی ہے اور کاغذ پر نگاہ جما دیتی ہے ۔۔۔ ایک دو لمحوں کے بعد کرسی سے اٹھ بیٹھتی ہے اور کھڑکی کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے ۔۔۔ کھڑکی کھولنے کے لیئے ہاتھ بڑھاتی ہے مگر پھر رک جاتی ہے ۔۔۔ دوبارہ کاغذ کو دیکھتی ہے ۔

کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیتی ہے ۔۔۔ باہر دیکھنے لگتی ہے۔

سٹیج پر اندھیرا چھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دریا کی لہروں کا شور آہستہ آہستہ بلند ہونے لگتا ہے ۔۔۔ بلند ہوتا جاتا ہے۔ تیز و تند ہوا کے تھپیڑوں سے کھڑکی کے دونوں پٹ زور زور سے ٹکراتے ہیں۔ اس شور میں سسکیوں کی آواز ابھر ابھر کر ڈوب جاتی ہے ۔۔۔ کئی لمحے یہ منظر رہتا ہے ۔۔۔ اس کے بعد لہروں کا شور مدھم ہوتا جاتا ہے۔ سٹیج پر روشنی پھیل جاتی ہے۔ روشنی میں فوزیہ کھڑکی میں سر جھکائے کھڑی ہے ۔۔۔ بال بکھرے ہوئے ہیں ۔۔۔ حسنی دروازے میں کھڑی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہی ہے۔ ریکارڈ ختم ہو چکا ہے اور اب گھر گھر کی آواز

آ رہی ہے

حسنی اس کی طرف جاتی ہے ـــ فوزیہ اس کی طرف دیکھتی ہے)

حسنی : آپا!

فوزیہ : کیا ہے؟ ـــ کیا کرنے آئی ہو؟

حسنی : بستر بچھا دیا ہے میں نے۔ صاب کہہ گئے تھے جلدی بستر بچھا دو۔

فوزیہ : اچھا!

حسنی : تم اتنی سرد ہوا میں کھڑکی کے پاس کھڑی ہو آپا! ـــ بڑی سردی ہو گئی ہے باہر تو طوفان ہے آپا۔

(فوزیہ اس کی طرف گھوم کر دیکھتی ہے ـــ حسنی نگاہوں کی تاب نہ لا کر گرامو فون کی طرف جاتی ہے سوئی ہٹا دیتی ہے۔ گھر گھر کی آواز بند ہو جاتی ہے)

فوزیہ : ابھی آئے نہیں وہ؟

حسنی : صاب؟ جی نہیں۔ ابھی ابھی تو گئے ہیں ناہید بی بی کو چھوڑنے۔ کہہ گئے تھے تمہاری آپا تھک گئی ہیں جلدی بستر بچھا دو ـــ پر تم ـــ سردی میں کیوں کھڑی ہو وہاں۔ آپا؟

فوزیہ : اِدھر آؤ۔

حسنی : جی کیا کروں؟

(فوزیہ اس کے پاس آجاتی ہے ـــ حسنی کھڑکی کے پٹ بند کر دیتی ہے ـــ

(لہروں کا شور اب بہت دور سے آتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ حسنی واپس آتی ہے)

فوزیہ: تمہارے ابّا کیسے تھے؟

حسنی (سوال پر حیران ہو کر): جی میرا باپو ——— اچھا آدمی تھا، نماز روزے کا پابند۔

فوزیہ: تم ان کی بڑی عزت کرتی تھیں۔

حسنی: ہاں! پر وہ بڑے سخت آدمی تھے ——— میں جوان ہو گئی پھر بھی مجھے مارا کرتے تھے۔ اللہ جنت نصیب کرے بڑے اچھے لوگ تھے۔

فوزیہ: حسنی!

حسنی: جی آپا!

فوزیہ: میں نے سنا ہے تم اپنے چاہنے والے کے ساتھ بھاگ گئی تھیں۔

حسنی (کانوں پر ہاتھ رکھ کر): نہ بابا ——— میں نے ایسی بے شرمی کی بات نہیں کی۔

فوزیہ: اوہ ——— یاد آیا ——— وہ ہماری پہلی نوکرانی تھی۔

حسنی: تمہارے اپنے گھر میں ———؟ وہاں ہو گی ایسی مردار، میں تو یہاں بیس سال سے ہوں۔

فوزیہ (کرسی میں بیٹھتے ہوئے): چائے بنا لاؤ گی؟

حسنی: بنا لاؤں گی ——— پر تم اپنے بستر پر چلو نا۔ یہاں کیا کریں گی۔ صاب کہہ گئے تھے ———!

فوزیہ: جاؤ حسنی!

حسنی : تو ۔۔۔۔ پیارا پاپا!

فوزیہ : جاؤ نا!

(حسنی دروازے سے نکل جاتی ہے۔ فوزیہ گراموفون کی طرف آتی ہے ۔۔۔ مگر کسی خیال کے آتے ہی تیزی سے کھڑکی کی طرف جاتی ہے۔ ادھر اُدھر نگاہ ڈالتی ہے جیسے کوئی چیز تلاش کر رہی ہو ۔۔۔۔ کھڑکی کے نیچے قالین پہ کاغذ پڑا ہے اُسے اٹھا لیتی ہے، پھر اسے مروڑ ڈالتی ہے ۔۔۔۔ شاید پھاڑنے کا ارادہ کر رہی ہے مگر اسے کھول کر پڑھنے لگتی ہے۔

لہروں کا شور قریب تر ہو گیا ہے۔

سٹیج پر تاریکی پھیل جاتی ہے ۔۔۔۔ کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرانے لگتے ہیں۔ ہوا کا ایسا شور جیسے چیخ رہی ہو۔

چند لمحے یہ منظر رہتا ہے ۔۔۔۔ اس کے بعد ایک نیا منظر سامنے آتا ہے۔ ایک سنسان سڑک، سامنے بجلی کا کھمبا جس کی مدھم روشنی اردگرد محدود جگہ پر پڑ رہی ہے۔

فوزیہ آتی ہے ۔۔۔ بال بکھرے ہوئے چہرے پر گہرے اضطراب کا نشان۔ معلوم ہوتا ہے قریب ہی دریا ہے ۔۔۔۔ لہروں کا سمع خراش شور برپا ہے۔

فوزیہ آگے قدم اٹھاتی ہے ۔۔۔۔ ایک لمحے کے لئے رُک جاتی ہے ۔۔۔ پھر قدم اٹھاتی ہے ۔۔۔ تیزی سے بڑھتی ہے ۔۔۔ کھمبے کے نیچے پہنچ کر رُک جاتی ہے ۔۔۔ سامنے دیکھتی ہے ۔۔۔۔ اس کے دیدے پھیل گئے ہیں۔

طوفان پہلے سے بڑھ چکا ہے۔

فوزیہ بڑھتی ہے ——— دونوں ہاتھ سر کی طرف لے جاتی ہے ——— چیخ مار کر پیچھے ہٹنے لگتی ہے ——— کھمبے سے ٹکراتی ہے ——— کسی چیز کے گرنے کی آواز آتی ہے ——— لہروں کا شور تھم جاتا ہے۔

سٹیج پر اندھیرا پھیل جاتا ہے ——— اور جب روشنی ہوتی ہے تو کمرے کے وسط میں فوزیہ کھڑی ہے اور اس کے سامنے حسنی نظر آ رہی ہے، حیران اور خوف زدہ۔ نیچے قالین پر چائے کا سارا سامان بکھرا پڑا ہے۔

(کھڑکی کے دونوں پٹ کھلے ہیں)

حسنی (آواز میں لرزش): آپا! ——— یہ کیا ہو گیا تھا تمہیں؟

(فوزیہ اس کی طرف گھور کر دیکھتی ہے)

میں نے کہا آپا!

فوزیہ: کیا ہے؟

حسنی: یہ کیا ہو گیا تھا؟ ڈر گئی تھیں آپا؟

فوزیہ: نہیں!

حسنی: تو ——— پھر کیا ہوا تھا؟ میں چائے لے کر آ رہی تھی، تم جیسے ڈر کر بھاگیں کھڑکی میں سے اور مجھ سے ٹکرا گئیں۔ سب کچھ گر پڑا۔

فوزیہ: جھوٹ کہتی ہو ——— !

حسنی: نہیں آپا - اللہ قسم کھاتی ہوں —— تمہیں کیا ہو گیا تھا؟

فوزیہ: حسنی! سب کچھ اٹھا کر لے جاؤ۔

حسنی: صاب مجھ پر خفا ہوں گے۔

فوزیہ: نہیں ہوں گے —— احتیاط نہیں کی تم نے قالین تباہ کر دیا ہے۔ پر خیر۔

حسنی: سچ کہتی ہوں آپا! —— میں اندر آئی ہی تھی کہ تم نے —— اللہ جانے تم ڈر سی گئی تھیں۔

فوزیہ: جاؤ اب —— اٹھاؤ سب کچھ۔

حسنی: صاب سے کہہ دیں کہ ——

فوزیہ: اس کی فکر نہ کرو۔ خاموشی سے چلی جاؤ۔

حسنی: تم چلو نا ادھر آپا (رازدارانہ لہجے میں) دریا کے کنارے بُری بُری بلائیں رہتی ہیں جو۔ اللہ بچائے ان سے۔

(حسنی سامان ٹرے میں رکھنے لگتی ہے)

میں تو کہتی ہوں صاب آجائیں گے ابھی —— تم انتظار نہ کرو ان کا۔ وہ کہہ جو گئے ہیں —— ناہید بی بی ہیں سو رہتیں تو اچھا تھا۔ صاب اتنی سردی میں گئے ہیں۔

(فوزیہ صوفے پر گر پڑتی ہے —— حسنی ٹرے اٹھا کر دروازے میں سے نکل جاتی ہے اس کے جانے کے بعد فوزیہ دروازے کے پردے کے پیچھے جاتی ہے اور جلد ہی باہر نکل آتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے دروازہ بند کر دیا ہے سو واپس آکر

وہ صوفے پر بیٹھ کر داہنے ہاتھ کی مٹھی کھولتی ہے ــــ اب کاغذ اس کے ہاتھ میں ہے ــــ کاغذ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگتی ہے ــــ قالین پر ننھے ننھے ٹکڑے اڑنے لگتے ہیں ــــ فوزیہ بے اختیار کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے۔ ابھی چند ٹکڑے اس کے ہاتھ میں ہیں ــــ قالین پر سے ایک ایک پرزہ اٹھانے لگتی ہے۔

لہروں کا شور بلند ہونے لگتا ہے ــــ وہ کھڑکی کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے ــــ کاغذ کے تمام پرزے باہر اڑا دیتی ہے۔ سٹیج پر تاریکی پھیل جاتی ہے۔

لہروں کا شور بلند تر ہو گیا ہے۔ اس میں سسکیوں کی آواز اُبھر اُبھر کر ڈوب رہی ہے کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔

لہروں کا شور اور سسکیوں کی آواز مدھم ہونے لگتی ہے۔

سٹیج پر روشنی پھیل جاتی ہے۔ فوزیہ کھڑکی کے پاس کھڑی ہے۔ بال بکھرے ہوئے رخساروں پر داغ ہے۔ دروازے پر مسلسل دستک اور اس کے بعد ناصر کی "فزی! فزی!" کہتی ہوئی آواز۔

فوزیہ کھڑکی سے سر ہٹاتی ہے ــــ چہرے پر ہاتھ پھیرتی ہے اور دروازے کی طرف اس طرح دیکھتی ہے جیسے ابھی ابھی اس نے دستک سنی ہو۔

دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتی ہے مگر کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک جاتی ہے ــــ کھڑکی کی طرف لوٹتی ہے۔ پٹ بند کر دیتی ہے ــــ پھر دروازے کی طرف جاتی ہے۔

دروازے کے پردے کے پیچھے جاتی ہے ـــــ دروازہ کھلتا ہے۔ ناصر اندر آتا ہے ـــــ فوزیہ کے ہونٹوں پر سوگوار سی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے ـــــ)

ناصر : فزی! تم اِدھر، یہ کیا بات ہے؟

فوزیہ : انتظار کر رہی تھی آپ کا۔

ناصر : کھڑکی کے پاس کھڑی ہو کر، اتنی سرد ہوا میں (اس کے چہرے پر نگاہ جما کر) باہر سر نکال کر دیکھتی رہی ہو چہرے پر پریشان کیسے ہیں؟

فوزیہ : (جلدی سے دوپٹے سے چہرہ پونچھتے ہوئے) کچھ بھی تو نہیں یہاں۔ آپ کو وہم ہو گیا ہے خواہ مخواہ ـــــ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔

ناصر : فزی! تم پریشان تو نہیں ہو؟

فوزیہ : پریشان آپ ہیں ـــــ اور مجھے بھی پریشان کر دینے کا ارادہ ہے۔ (چہرے پر وہی سوگوار مسکراہٹ)

ناصر : نہیں فزی!

(فوزیہ دروازے سے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے۔ ناصر بھی اس کے پاس آ بیٹھتا ہے)

فوزیہ : چھوڑ آئے ناہید کو اس کے گھر؟

ناصر : اسے چھوڑنے ہی تو گیا تھا! ـــــ تو فزی!

فوزیہ : میں بالکل ٹھیک ہوں ـــــ صرف ـــــ

ناصر: صرف کیا؟

فوزیہ: جب آپ گئے تو نہ جانے میرے دل میں ذرا سا خوف کیوں پیدا ہو گیا۔

ناصر: خوف؟

فوزیہ: ذرا سا خوف —— یا وہم —— سوچنے لگی ہوا بہت تند و تیز ہے کہیں خدانخواستہ آپ کو کوئی حادثہ پیش نہ آ جائے۔

ناصر: حادثہ تو کوئی خاص پیش نہیں آیا۔ البتہ ایک ناگوار سا واقعہ ضرور ہوا دریا کے پُل پر۔

فوزیہ: کہاں؟

(فوزیہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر شوہر کو دیکھنے لگتی ہے)

ناصر: اس قدر خوف زدہ کیوں ہو گئی ہو؟ بات بالکل معمولی تھی —— جب گاڑی پُل پر پہنچی تو ناہید نے ڈر کر کہا۔ "بھائی جان جلدی چلو"

فوزیہ: پھر؟

ناصر: ذرا ڈر گئی تھی —— جب گاڑی پُل پر سے گذر گئی تو کہنے لگی میں نے اندھیرے میں ایک پرچھائیں سی دیکھی تھی، جیسے کوئی آدمی کھڑا ہے۔

(فوزیہ ٹکٹکی باندھ کر شوہر کو دیکھ رہی ہے)

فوزیہ: تو —— ؟

ناصر: یونہی وہم ہو گیا تھا اسے۔ اتنی سردی میں دریا کے پُل پر کون کھڑا ہو سکتا ہے —— ناہید کہتی تھی ممکن ہے کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے آیا ہو خیر اب

تم چلو کمرے میں۔

(فوزیہ چپ چاپ کھڑی ہو جاتی ہے۔ ناصر دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ فوزیہ سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے جا رہی ہے۔ دروازے پر پہنچ کر ناصر بجلی کا سوئچ دبا دیتا ہے۔ کمرے میں اندھیرا پھیل جاتا ہے ——— قریب سے ناصر کی آواز آتی ہے فوزی! ——— کہاں ہو فوزی! ——— فزی!" یہ آواز بتدریج دور رہتی جاتی ہے)

جب سٹیج پر روشنی آتی ہے تو وہ اس قدر مدھم ہوتی ہے کہ اس میں صرف لیٹی ہوئی فوزیہ کا چہرہ نظر آتا ہے۔ اس کی پیشانی پر پٹی بندھی ہے۔ ناصر کے چہرے کا سایہ اس پر جھکا ہوا ہے۔

دور لہروں کا شور آتا ہوا سنائی دے رہا ہے۔

ناصر: فزی! یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا ——— یہ کیا ماجرا ہے فزی؟

(فوزیہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہی ہے)

بتاتیں کیوں نہیں ——— فزی! فزی!

(فوزیہ کے دیدے اور پھیل جاتے ہیں)

میں یہ معما سمجھ نہیں سکتا ——— تم پاگلوں کی طرح دریا کی طرف کیوں جا رہی تھیں؟

(لہروں کا شور بڑھنے لگتا ہے)

مجھے حسنی نے سوتے میں اٹھا کر کہا تم باہر چلی گئی ہو ——— میں فوراً بھاگا ——— تم آخری کھیت میں درخت سے ٹکرا کر گر پڑی تھیں اور بے ہوش ہو گئی تھیں۔

فوزیہ: وہ کہاں ہے؟

ناصر: کون؟

(فوزیہ بے تابی سے اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے)

فوزیہ: وقت گزر گیا ہے ——

(لہروں کا شور بڑھ گیا ہے)

اس نے چھلانگ لگا دی ہے —— وہ ڈوب رہا ہے —— وہ ڈوب رہا ہے۔

ناصر: کون؟

فوزیہ (جیسے ایک دم چونک کر): وہ —— پرچھائیں۔

ناصر (انتہائی حیرت کے عالم میں): پرچھائیں ——؟

(لہروں کے طوفانی شور میں پردہ جلدی سے گرتا ہے)

شاہینہ

افرادِ تمثیل

تہوّر خاں	باپ
ناصر خاں	بیٹا
شاہینہ	بیٹی
گُل میرا	خادمہ

منظر:

(یہ تمثیل جس کمرے میں وقوع پذیر ہوتی ہے اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کی دیواروں پر جا بجا ہرنوں اور شیروں کی کھالیں لٹکی ہوئی ہیں۔ سامنے کی دیوار پر لٹکے ہوئے ایک خوبصورت اور بیش قیمت قالین کے اوپر ایک ہرن کا سر دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سر کافی بڑا ہے۔

فرش پر دری اور قالین، کرسیاں، صوفہ سیٹ اور ایک ٹیبل، ایک تپائی۔ دائیں دیوار میں ایک دروازہ جس کی دوسری طرف تہوّر خاں کی خوابگاہ ہے۔ دوسرا دروازہ بائیں دیوار کے اس طرف ہے۔ دونوں پر سرخ رنگ کے پردے پڑے ہیں۔

کمرے پر پہلی نظر ڈالتے ہی رعب و جلال کا تاثر چند لمحوں کے لئے ذہن پر چھا جاتا ہے۔

موسم سرما کی ایک شام۔ کمرے کے برقی قمقمے روشن۔

پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج خالی نظر آتی ہے۔ تین چار لمحے خالی رہتی ہے۔

خوابگاہ والے دروازے کے پردے کو جنبش ہوتی ہے۔ ناصر خاں باہر آتا ہے۔

ناصر خاں چوبیس پچیس سال کا خوبرو نوجوان ہے۔ شاندار سوٹ پہنے ہوئے۔ چہرے پر افغانی خون کی سرخی و تابندگی۔

خوابگاہ کے دروازے سے نکل کر وہ چند لمحوں کے لیئے رُکتا ہے اور پھر تیزی سے چلنے لگتا ہے۔

ابھی وہ کمرے کے وسط ہی میں پہنچا ہے کہ خوابگاہ والے دروازے کا پردہ ہٹا کر تہور خاں آتا ہے۔

تہور خاں کی عمر پچپن کے قریب ہو گی۔ چہرے پہ خشونت، سُرخ و سفید رنگ، لمبی لمبی مونچھیں، لباس شلوار، لمبا کرتہ اور سُرخ رنگ کی نہایت اعلیٰ واسکٹ، سر پہ قراقلی ٹوپی، گردن میں ریشمی مفلر لپٹا ہوا، پاؤں میں زری کی چپل۔

ناصر خاں باپ کی موجودگی سے بے خبر چلا جا رہا ہے۔ تہور خان اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے)

تہور خاں: ناصر! (ناصر ایک دم ٹھٹک جاتا ہے۔ مڑ کر دیکھتا ہے اور وہیں رُک جاتا ہے تہور خاں اس پر نگاہیں گاڑے آگے بڑھنے لگتا ہے) کہاں جا رہے ہو؟

ناصر خاں: بابا جان!

تہور خاں: کہاں جا رہے ہو۔ سُنا نہیں تم نے؟ (تہور خاں بیٹے کے سامنے اُکھڑا ہوتا ہے)

ناصر خاں: ایک دوست یہاں سے جا رہا ہے، اسے الوداع کہنے سٹیشن پر جا رہا

ہوں۔

تہور خاں: دوست کو الوداع کہنے جا رہے ہو۔ ہوں! (ناصر خاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے) کیا اسے ہمیشہ کے لئے الوداع کہنے کا ارادہ ہے؟

(ناصر خاں گھبرا کر غیر ارادۃً اپنا دایاں ہاتھ کوٹ کی دائیں جیب پر رکھ دیتا ہے، پھر ہاتھ ہٹا لیتا ہے)

ناصر خاں: کیا کہا بابا!

تہور خاں: دوست جا رہا ہے یا دشمن؟

ناصر خاں: سٹیشن پر جا رہا ہوں۔ آپ نے پوچھا کیا ہے بابا؟

تہور خاں: دوست نہیں دشمن کو رخصت کرنے جا رہے ہو۔ دوست کے لئے ہار لے کر جاتے ہیں اور تم کیا لئے جا رہے ہو۔ یہ دوستی کی نشانی ہے یا دشمنی کی۔ کہو!

ناصر خاں: بابا آپ۔

تہور خاں: پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ مگر تم جواب دو گے کیا۔ جو چیز تم نے جیب میں ڈالی ہے وہ بتا رہی ہے کہ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ ناصر! تم نہیں جا سکتے۔!

ناصر خاں: مجھے جانے دیجئے بابا!

تہور خاں: خان تہور خاں کی زندگی میں اس کا بیٹا —— باپ سے کچھ کہے بغیر اس طرح نکل کھڑا ہو —— یہ نہیں ہو سکتا۔

ناصر خاں: بابا! میں نے آپ کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا۔ آپ میرا راستہ کیوں روک رہے ہیں؟

تہور خاں: تمہارا نہیں اس چیز کا راستہ روک رہا ہوں جسے تم نے ابھی ابھی میری خوابگاہ میں داخل ہو کر اپنی جیب میں ڈالا ہے۔

ناصر خاں: آج ایک زندگی کا سوال ہے۔

تہور خاں: میں اتنا بوڑھا نہیں ہوں بیٹے کہ اپنے بچے کی زندگی بچانے کے لئے میرے بازوؤں میں سکت ہی نہ ہو۔ ابھی میرے پاس بہت کچھ ہے۔ طاقت، جرأت اور غیرت۔ میں نے زندگی بھر بھاری بھاری پتھروں کو ہٹا کر اپنا راستہ صاف کیا ہے۔ کیا آج کوئی اتنا بھاری پتھر آ پڑا ہے جسے ہٹاتے ہوئے میری ہمت جواب دے دے گی؟

ناصر خاں: میں جانتا ہوں۔

تہور خاں: جانتے ہو تو پھر بتاتے کیوں نہیں۔ تہور خاں اپنی زندگی میں اپنے لخت جگر کی زندگی کو موت کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ صاف صاف بتاؤ کیا تکلیف پہنچی ہے تمہیں، کس نے تمہاری غیرت کو جھنجھوڑا ہے؟ کون ہے وہ ملعون؟ بتاؤ۔!

ناصر خاں: ایسی کوئی بات نہیں۔

تہور خاں: ایسی کوئی بات نہیں تو پھر معاملہ کیا ہے۔ ناصر میں کیا پوچھ رہا ہوں؟

ناصر خاں (متذبذب حالت میں): کچھ نہیں ہے بابا!

(ناصر جانے لگتا ہے)

تہور خاں: کچھ نہیں —؟ ٹھہرو!

(ناصر رُک جاتا ہے)

اپنے باپ کو ایک بچہ سمجھتے ہو کیا؟ تمہاری زبان خاموش رہ سکتی ہے مگر نگاہوں کو کس طرح خاموش کر سکو گے؟ میں جانتا ہوں - جب رگوں میں دوڑتا ہوا خون بھڑکتی ہوئی آگ بن جائے تو جوانی انسان کا ہاتھ پکڑ کر کس راستے کی طرف لے جاتی ہے۔ کہو کون ہے وہ لڑکی اور کون ہے وہ تمہارا رقیب؟ کہو!

ناصر خاں: میں کہہ چکا ہوں -

تہور خاں: کیا کہہ چکے ہو؟

ناصر خاں: میں نے آپ کے معاملات میں کبھی ——

تہور خاں (الفاظ کاٹتے ہوئے اور غصے سے ہاتھ بلند کرتے ہوئے): بند کرو اپنی زبان، مجھے ٹالنے کی کوشش کر رہے ہو!

ناصر خاں: نہیں بابا -

تہور خاں: (ناصر خاں کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) اپنے باپ پر اعتماد نہیں تمہیں؟

ناصر خاں: مجھے اپنے باپ پر فخر ہے -

تہور خاں: فخر کرتے ہو اعتماد نہیں کرتے۔

ناصر خاں: اعتماد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اپنے راستے پر چلنے کے لئے آزاد ہوں۔

تہور خاں: میں تمہیں اس راستے پر ہرگز نہیں چلنے دوں گا جہاں موت کھڑی ہے۔ ڈالو جیب میں ہاتھ۔

(ناصر سر جھکائے کھڑا رہتا ہے)

سُنا نہیں تم نے! میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ڈالو جیب میں ہاتھ۔

(ناصر اب بھی اسی عالم میں کھڑا ہے)

تم نہیں نکالو گے۔ میں خود نکال سکتا ہوں۔

(تہور خاں ناصر خاں کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالتا ہے اور خونخوار نظروں سے اسے دیکھنے لگتا ہے۔ دو تین لمحے گزر جاتے ہیں)

اور سُنو!

(ناصر خاں استفسار طلب نظروں سے باپ کو دیکھتا ہے)

اگر تم نے میری اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم رکھا تو میرا دروازہ تمہارے لئے بند ہو جائے گا اور میری زندگی کی آخری سانس تک بند رہے گا۔

ناصر خاں: بابا!

تہور خاں: جاؤ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ جاؤ!

(ناصر خاں ایک لمحے کے لئے غضب ناک باپ کو دیکھتا ہے اور پھر دروازے کی طرف جانے لگتا ہے —— پردہ ہٹاتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

تہور خاں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ جب وہ دروازے میں سے نکل جاتا ہے تو وہ خوابگاہ کی طرف چلا جاتا ہے —— اب سٹیج خالی ہے۔

دو تین لمحے گزر جاتے ہیں۔ تہور خاں خوابگاہ کے دروازے سے باہر نکلتا ہے اب اس کے ہاتھ میں پستول نہیں ہے۔ اس طرح قدم اٹھا رہا ہے جیسے کسی گہری سوچ میں غرق ہو۔

کرسیوں کے پاس پہنچ کر دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے "گل میرے" لکر آواز دیتا ہے۔

گل میرا دروازے پر آتی ہے)

گل میرا: جی خان!

تہور خاں: شاہینہ کیا کر رہی ہے؟

گل میرا: اپنے کمرے میں ہے۔

تہور خاں: اِدھر بھیج دو۔

گل میرا: بہت اچھا خان!

(گل میرا چلی جاتی ہے۔ تہور خاں دروازے کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ شاہینہ آتی ہے۔ شلوار قمیص، سویٹر اور دوپٹے میں ملبوس۔ چھریرے بدن کی خوبصورت

لڑکی، بھائی سے ایک دو سال چھوٹی، رنگ سرخ و سفید، چہرے پر ایک باوقار سنجیدگی۔

شاہینہ کمرے میں آکر باپ کے سامنے مؤدبانہ کھڑی ہو جاتی ہے،

(تہور خاں بدستور اپنی سوچ میں گم سُم ہے)

شاہینہ: بابا جان! آپ نے یاد فرمایا ہے؟

تہور خاں: اچھا تم آگئیں۔ کیا کر رہی تھیں اس وقت؟

شاہینہ: مطالعہ کر رہی تھی۔

تہور خاں: مطالعہ کر رہی تھیں۔ اچھی چیز ہے مطالعہ مگر ہر وقت مناسب نہیں۔

ہاں تو شاہینہ بیٹی!

شاہینہ: جی بابا جان!

تہور خاں: جو بات اس وقت تم سے کہنا چاہتا ہوں وہ ایسی نہیں جو ایک باپ بلا تکلف اپنی بیٹی سے کہہ دے لیکن تمہارے سوا اب اس گھر میں ہے کون؟ تمہاری ماں زندہ رہتی تو آج تم سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

شاہینہ: کیا ہے بابا جان؟

تہور خاں: تمہارے بھائی کے متعلق ایک بڑی اُلجھن میں مبتلا ہوں۔ کئی دن سے اسے پریشان دیکھ رہا تھا۔ آج میں اپنی خوابگاہ میں تھا کہ اسے ادھر آتے دیکھا۔ اس انداز سے آ رہا تھا کہ میرے دل میں ایک شبہ سا پیدا ہو گیا اور میں پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ اس وقت وہ خوابگاہ میں کیا کرنے آیا ہے۔

وہ اندر آیا اور میرا پستول جیب میں ڈال کر جانے لگا۔

(شاہینہ پریشان ہو کر باپ کو دیکھتی ہے)

اگر میں اسے دیکھ نہ لیتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔

شاہینہ: آپ نے کیا کیا ہے؟

تہور خاں: میں نے پستول لے لیا ہے اس سے۔ لیکن میرے انتہائی اصرار کے باوجود اس نے کچھ نہیں بتایا۔ تمہیں میں نے اس لئے بلایا ہے کہ تم اس معاملے پر روشنی ڈال سکوگی۔

(شاہینہ خاموش کھڑی رہتی ہے)

شاہینہ بیٹی! کیا معاملہ ہے؟

شاہینہ: کیا عرض کروں؟

تہور خاں: ناصر نے کسی سے جھگڑا کیا ہے؟

شاہینہ: آپ اس کی عادت جانتے ہیں۔ کبھی کسی سے جھگڑتا ہی نہیں۔

تہور خاں: کسی سے جھگڑتا نہیں۔ یہ درست ہے تو قصہ کیا ہے؟

شاہینہ: کیا عرض کر سکتی ہوں بابا جان!

تہور خاں: میں نے اس سے پوچھا تھا وہ کون لڑکی ہے جسے تم یہاں لانا چاہتے ہو اور وہ کون شخص ہے جو تم سے دشمنی کر رہا ہے۔ اس نے کچھ نہیں بتایا۔ تم دونو کو آپس میں بڑی گہری محبت ہے۔ مجھے یقین ہے تم بتا سکتی ہو کہ وہ کون لڑکی ہے۔

کہاں رہتی ہے، اس کے مراسم کیسے ہیں اس کے ساتھ۔ اور ــــ سبھی کچھ
بتا سکتی ہو مجھے۔

(شاہینہ چپ چاپ کھڑی رہتی ہے)

شاہینہ بیٹی!

شاہینہ: کاش میں کچھ بتا سکتی۔!

تہور خاں: جانتی ہو تو کیوں نہیں بتاتیں۔ راز چھپانے میں کیا فائدہ ہے۔ میں باپ
ہوں، دشمن نہیں ہوں اپنی اولاد کا۔

شاہینہ: میں سچ کہتی ہوں بابا!

تہور خاں: کیا؟

شاہینہ: بھائی جان کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں ہے۔

تہور خاں: سچ کہہ رہی ہو؟

شاہینہ: ہاں بابا!

(تہور خاں بیٹی کو گھور گھور کر دیکھنے لگتا ہے)

تہور خاں: توقع تھی تم بتا سکو گی۔ اچھا! جاؤ۔

(شاہینہ جانے لگتی ہے)

مگر دیکھو! تم اس سے پوچھ تو سکتی ہو۔

(شاہینہ کوئی جواب نہیں دیتی۔ دروازے میں سے نکلنے لگتی ہے ــــ پھر رک جاتی ہے)

شاہینہ: باباجان! آپ نے پستول اس سے لے لیا تھا نا؟

تہور خاں: ہاں!

(شاہینہ چلی جاتی ہے۔ تہور خاں کرسی میں بیٹھ جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد اٹھتا ہے۔ دروازے تک جاتا ہے اور وہاں سے پلٹ آتا ہے۔ خوابگاہ کے دروازے تک جاتا ہے۔ پردہ ہٹاکر اندر جانے کا ارادہ کرتا ہے مگر پردہ ہاتھ سے چھوڑ کر وہاں سے ہٹ جاتا ہے۔ کرسیوں کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ دروازے پر گل میرا آتی ہے)

گل میرا: خان! چائے لاؤں؟

تہور خاں: ناصر کہاں ہے؟

گل میرا: شاید اپنے کمرے میں۔

تہور خاں: شاید کیا مطلب؟ دیکھا نہیں تم نے؟

گل میرا: میں نے دیکھا نہیں خان! —— لاؤں چائے۔؟

(تہور خاں کوئی جواب نہیں دیتا۔ گل میرا دو تین لمحے انتظار کرنے کے بعد چلی جاتی ہے۔ تہور خاں وہاں کھڑا رہتا ہے۔ پھر دروازے کی طرف قدم اٹھانے لگتا ہے۔

ایک لمحے کے لئے رکتا ہے —— اس کے بعد نکل جاتا ہے۔

اب سٹیج پھر خالی ہے۔

دو چار لمحوں کے بعد شاہینہ آتی ہے اِدھر اُدھر دیکھتی ہے جیسے باپ کو دیکھ رہی ہو

پھر خوابگاہ کا پردہ ہٹا کر اندر چلی جاتی ہے۔

جلدی سے باہر نکل آتی ہے۔ دروازے کی طرف تیزی سے جانے لگتی ہے تہور خاں

آتا ہے)

تہور خاں: کچھ کہا اس نے شاہینہ بیٹی؟

شاہینہ: باباجان! میں کچھ دیر کے لئے گھر سے باہر جانا چاہتی ہوں۔

تہور خاں: کیوں؟

شاہینہ: اسی سلسلے میں آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

تہور خاں: فی الحال نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی۔ جاؤ۔ ڈرائیور اپنی کوٹھڑی میں ہوگا،

گل بیرے سے کہو لے آئے۔

شاہینہ: میں خود ہی ڈرائیو کر لوں گی۔

(شاہینہ دروازے پر جا کر ٹھہر جاتی ہے)

بھائی جان کو میرے جانے کا علم نہ ہونا چاہئے۔

تہور خاں: میں نے اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا ہے۔

(شاہینہ چلی جاتی ہے۔ تہور خاں صوفے پر بیٹھ جاتا ہے۔

گل بیرا چائے لے کر آتی ہے۔ تپائی تہور خاں کے سامنے رکھ کر اس پر ٹرے رکھ

دیتی ہے۔

تہور خاں بدستور فکر میں غرق بیٹھا ہے۔

گل میرا چائے بنا کر پیالی تھور خاں کی طرف بڑھاتی ہے۔

تھور خاں پیالی ہاتھ میں لے لیتا ہے مگر ہونٹوں تک نہیں لے جاتا۔

گل میرا حیرت سے تھور خاں کو دیکھ رہی ہے ــــ پھر خالی ٹرے اٹھانے لگتی ہے۔

تھور خاں پیالی منہ سے لگاتا ہے۔ دو گھونٹ پیتا ہے۔ پیالی تپائی پر رکھ دیتا ہے

اور ہاتھ سے اشارہ کرتا ہے ــــ جیسے کہہ رہا ہو لے جاؤ۔

گل میرا برتن ٹرے میں رکھتی ہے اور جانے لگتی ہے۔

کسی قدر دور سے دروازے پر زور زور کی دستک اور اس کے ساتھ ناصر خاں کی

آواز "بابا جان! بابا جان!"

گل میرا تھور خاں کو دیکھتی ہے)

تھور خاں: دروازہ نہیں کھلے گا، سُنا!

گل میرا: اچھا خان!

(گل میرا ٹرے اٹھا کر جانے لگتی ہے۔ تھور خاں اسے جاتے ہوئے دیکھتا

رہتا ہے۔

دروازے کی کھٹ کھٹ بلند ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ ناصر خاں کی آواز بھی۔

تھور خاں کوچ سے اٹھتا ہے اور کمرے میں پھرنے لگتا ہے۔

ناصر خاں کسی قدر دور بند دروازے پر زور زور سے مکّے مار رہا ہے۔ "بابا! دروازہ

کھولو، دروازہ کھولو بابا!"

تہور خاں اس طرح قدم اٹھا رہا ہے جیسے بڑا مضطرب ہے تیزی سے چلتے چلتے رُک جاتا ہے۔ رُک کر پھر چلنے لگتا ہے۔ ایسی آواز آتی ہے جیسے شیشہ ٹوٹ رہا ہو۔

گل میرا بھاگی بھاگی آتی ہے)

گل میرا : خان! چھوٹے خان نے کھڑکی کا شیشہ ——

تہور خاں : جاؤ —— دفع ہو جاؤ —— جاؤ!

(گل میرا چلی جاتی ہے۔

شیشے کی جھنکار —— تہور خاں دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔

ناصر خاں آتا ہے۔ ہاتھ زخمی ہیں۔ اندر آتے ہی باپ سے لپٹ جاتا ہے)

ناصر خاں : بابا! مجھے جانے دو —— مجھے نہ روکو —— بابا!

تہور خاں : ناصر!

ناصر خاں : میں جا رہا ہوں بابا!

تہور خاں : نہیں، ہرگز نہیں۔

ناصر خاں : مجھے کیوں روکتے ہو بابا؟

تہور خاں (ناصر خاں کو پرے دھکیلتے ہوئے) تمہیں اپنے باپ پر اعتماد نہیں خنزیر کتے!

ناصر خاں : آپ غلط سمجھے ہیں بابا! یہ معاملہ میری زندگی کا نہیں ہے ——

تہور خاں : تمہاری زندگی کا نہیں تو کس کی زندگی کا معاملہ ہے؟

ناصر خاں : شاہلینہ کی زندگی کا!

تہور خاں: شاہینہ کی زندگی کا؟ کیا کہہ رہے ہو تم ناصر!

ناصر خاں: شاہینہ ثریا کے گھر میں جانا چاہتی ہے۔ ثریا کا بھائی اسے ہمیشہ اپنے انتہائی خلوص کا یقین دلاتا رہا ہے اور شاہینہ کو اس کے خلوص پر پورا اعتماد تھا، مگر اب وہ دھوکا دینا چاہتا ہے۔ کراچی جا کر کسی لڑکی سے نکاح کر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں شاہینہ کی کیا حالت ہو گی، اس کے دل کو کتنا صدمہ پہنچے گا۔ جمیل آج ہی جا رہا ہے۔ میں اسے روکنا چاہتا ہوں۔ اسے ہر حالت میں روکوں گا۔ میری بہن کو ایسا خوفناک فریب دے کر وہ نہیں جا سکتا بابا!

(تہور خاں اسے گھور کر دیکھ رہا ہے۔ ناصر خاں جانے لگتا ہے)

تہور خاں: ناصر!

(ناصر خاں جاتے جاتے رُک جاتا ہے)

ناصر خاں: بابا!

تہور خاں (گرج کر): ٹھہرو!

(ناصر خاں وہیں رُک جاتا ہے۔ تہور خاں تیزی سے خوابگاہ میں جاتا ہے اور پھر جلدی سے دروازے کے باہر آتا ہے)

میرا پستول کہاں ہے؟

ناصر خاں: میں نہیں جانتا بابا!

تہور خاں (بڑے غصے میں): تم نہیں جانتے تو اور کون جانتا ہے۔ لاؤ پستول۔

سُنا نہیں تم نے۔ ناصر!

(تہور خاں انتہائی غصے کی حالت میں ناصر خاں کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کا جسم کانپ رہا ہے۔ دروازے پر شاہینہ آتی ہے۔ بال بکھرے ہوئے اور آنکھیں پھٹی پھٹی۔ رنگ زرد ہے، تہور خاں اور ناصر خاں دونوں اسے دیکھ کر جیسے چونک سے پڑتے ہیں)

ناصر خاں: شاہینہ!

(شاہینہ آگے بڑھنے لگتی ہے۔ اس کی چال میں اب بھی ایک وقار اور جلال ہے۔ تہور خاں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا ہے)

تہور خاں: کہاں گئی تھیں تم؟

شاہینہ: اپنا فرض آپ ادا کرنے!

(شاہینہ گریبان میں ہاتھ ڈال کر پستول نکالتی ہے اور اسے پرے پھینک دیتی ہے)

تہور خاں اور ناصر خاں (ایک ساتھ): شاہینہ!

(پردہ تیزی سے گرتا ہے)

قندیل

افرادِ تمثیل

شالی آغا	ایک مصور
احمد عارف	شالی آغا کا دوست
سلیم	شالی آغا کا شاگرد

پہلا منظر

شاہی آغا کا اسٹوڈیو

فرش پر دری اور قالین۔ دیواروں پر رنگا رنگ تصویریں۔ درمیان میں ایک بڑی گول میز جس پر کتابیں، کچھ فائل، سیاہی کی شیشی، قلم، رنگین پنسلیں، برش، رنگوں کے ڈبے اور اسی قسم کا متفرق سامان پڑا ہے۔

میز کے پاس ایزل

دائیں اور بائیں دیوار کے ساتھ صوفہ سٹ، ایک طرف چار کرسیاں اور ان کے درمیان ایک چھوٹی میز پر چائے کی ٹرے، سگرٹ کا ڈبہ، ایش ٹرے، دیا سلائی کی ڈبیا۔

دروازہ دائیں دیوار میں۔ دروازے پر ریشمی پردہ۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو دن کے تین چار بجے ہیں۔ سردیوں کا کوئی مہینہ ہے سلیم چھوٹی میز کے پاس کرسی میں بیٹھا ہے۔ عمر پچیس کے لگ بھگ۔ لباس کوٹ پتلون۔

ہاتھ میں چائے کی پیالی جسے آہستہ آہستہ ہونٹوں کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک گھونٹ پیتا ہے اور پھر پیالی میز پہ رکھ کر سگرٹ سلگا کر لمبا کش لگاتا ہے۔

احمد عارف آتا ہے۔ ادھیڑ عمر کا آدمی، لباس پاجامہ اور سیاہ اچکن — چہرے پر تفکر اور سنجیدگی۔

احمد عارف کو کمرے میں آتے دیکھ کر سلیم کرسی سے اٹھ بیٹھتا ہے اور احمد عارف کی طرف بڑھتا ہے۔

احمد عارف: شالی آغا کہاں ہے سلیم؟

سلیم: باہر گئے ہیں!

احمد عارف (ایزل کی طرف دیکھ کر): تصویر کہاں ہے؟

سلیم: نمائش کے لئے انہوں نے تصویر نہیں بنائی۔

احمد عارف: کیا مطلب! نمائش میں صرف چند روز باقی رہ گئے ہیں اور شالی آغا نے ابھی تصویر مکمل ہی نہیں کی —!

سلیم: مکمل ہو گی ہی نہیں عارف صاحب!

احمد عارف: علیل ہیں کیا؟

سلیم: میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے وہ باہر گئے ہیں۔

احمد عارف: تو پھر قصّہ کیا ہے؟

سلیم: ان کی طرف سے مایوس ہی ہو جائیے —!

احمد عارف: بھئی سوسائٹی اعلان کر چکی ہے کہ اس نمائش میں شالی آغا کا نیا شاہکار دکھایا جائے گا اور تم کہتے ہو ان کی طرف سے مایوس ہو جایئے۔

سلیم: عارف صاحب! آپ یقین نہیں کریں گے مگر واقعہ یہ ہے کہ آغا صاحب اب شاید ہی کوئی نئی تصویر بنا سکیں گے۔

احمد عارف: قصہ کیا ہے؟ ذرا کھل کر بات کرو نا۔

سلیم: آپ جب کبھی پہلے یہاں آتے تھے تو آغا صاحب کے شاگردوں کا ایک ہجوم یہاں موجود ہوتا تھا۔ لیکن آج آپ صرف مجھے دیکھ رہے ہیں۔

احمد عارف: میں نے سمجھا تھا شاگرد لوگ دوسرے کمروں میں ہوں گے۔

سلیم: سب کے سب جا چکے ہیں۔ آغا صاحب نے انہیں یہ کہہ کر بھیج دیا ہے کہ اب میں نے مصوری کا پیشہ ترک کر دیا ہے۔ تم لوگوں کو کچھ بھی نہیں سکھا سکوں گا۔

احمد عارف: وجہ کیا ہے اس کی؟

سلیم: کاش میں جان سکتا!

احمد عارف: میں تو یہ توقع لے کر آیا تھا کہ آغا صاحب نے نئی تصویر بالکل مکمل کر لی ہو گی۔ مگر تم ایک عجیب ہی قصہ سنا رہے ہو۔

سلیم (میز کی طرف اشارہ کر کے): ذرا ادھر دیکھئے۔ رنگوں پر گرد جم چکی ہے۔ برشوں کو کسی نے کئی دن سے چھوا تک نہیں۔ ایزل کی حالت دیکھ لیجئے اور آغا صاحب کی

کیفیت یہ ہے کہ وہ بیشتر وقت باہر گذارتے ہیں۔ یہاں آتے ہیں تو چپ چاپ رہتے ہیں۔ کچھ پوچھتا ہوں تو انتہائی مختصر طور پر جواب دے دیتے ہیں ورنہ خاموش رہتے ہیں۔

احمد عارف: ان کی زندگی میں کوئی حادثہ تو پیش نہیں آیا۔

سلیم: کہہ نہیں سکتا —— کم از کم میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

احمد عارف: آخری تصویر انہوں نے کب بنائی تھی؟

سلیم: شاید یہی ایک حادثہ ہے جس سے میں واقف ہوں۔

احمد عارف: کیا حادثہ ہے؟

سلیم: ایک دن اتفاقاً ان کی خوابگاہ میں چلا گیا —— دیکھا کہ پلنگ کے پاس دیوار کے ساتھ ایک تصویر نظر آ رہی ہے —— میں نے تصویر اٹھالی —— یہ ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ میں نے اسے وہیں رکھ دیا اور جب چند روز بعد وہاں گیا تو فرش پر تصویر کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔

احمد عارف: شانی آغا نے خود ہی تصویر پھاڑ دی تھی؟

سلیم: ظاہر ہے!

احمد عارف: کوئی فن کار اپنی تخلیق ضائع نہیں کر سکتا —— معلوم ہوتا ہے یہ حادثہ کسی گہرے غم کی پیداوار ہے۔

سلیم: آپ جانتے ہیں شانی آغا ان لوگوں میں ہیں جو غم میں گھل گھل کر مر جائیں گے

مگر دل کا بھید زبان پر کبھی نہیں لائیں گے۔

احمد عارف: اس کے بعد شالی آغا نے کوئی تصویر نہیں بنائی؟

سلیم: قطعاً نہیں —— بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنے فن سے کچھ بیزاری سی ہو گئی ہے۔

احمد عارف: ملک کا اتنا بڑا فن کار زندہ رہتے ہوئے بھی مر جائے یہ ایک نہایت دردناک حادثہ ہے۔ ابھی تو شالی آغا کو کئی شاہکار مکمل کرنا ہیں۔ اگر اس کی یہی حالت رہی تو کیا ہوگا۔ (سلیم کے کندھے پر دایاں ہاتھ رکھ کر) فکر نہ کرو سلیم! میں شالی آغا کو مرنے نہیں دوں گا —— شالی آغا زندہ رہے گا! ہاں جب آئے تو تم دوسرے کمرے میں چلے جانا۔

سلیم: بہتر!

(دروازے کا پردہ ہٹا کر شالی آغا آتے ہیں۔ دراز قد، دبلے پتلے آدمی محنت شاقہ کی وجہ سے صحت کمزور، گال پچکے ہوئے، عمر کا اندازہ چہرے سے نہیں کیا جا سکتا۔ آنکھوں پر عینک، سوٹ میں ملبوس)

احمد عارف: بھئی بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ کہاں تھے تم؟

شالی آغا: تمہیں سلیم نے بتایا نہیں؟

احمد عارف: بتایا تھا کہ تم کہیں باہر گئے ہو۔

شالی آغا: یہ نہیں۔

احمد عارف: تو اور کیا؟

شالی آغا: تصویر نہیں بنا سکا۔ آئندہ میرا نام کسی نمائش میں شامل نہ کرنا۔

(احمد عارف سلیم کی طرف دیکھتا ہے سلیم کمرے سے نکل جاتا ہے)

احمد عارف: میں تصویر لینے نہیں آیا۔ نمائش میں شرکت کرو یا نہ کرو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کسی اور مقصد کے لئے آیا ہوں۔

شالی آغا: کیا مقصد ہے وہ؟

احمد عارف (شالی آغا کے قریب ہوتے ہوئے): شالی! تم ایک بہت بڑے فن کار ہو اور میں تمہارا عقیدت مند اور اگر مناسب سمجھو تو مجھے بھی ایک معمولی درجے کا مصور سمجھ لو۔ ایسا سمجھ سکتے ہو کیا؟

شالی آغا: تم فن کار ہو یہ میں خوب جانتا ہوں۔ ہاں

احمد عارف: ہم دونوں فن کار ہیں —— اس لئے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہنا چاہئے۔

شالی آغا: شریک رہنا چاہئے کیا مطلب؟

احمد عارف: اگر میرے دل میں کوئی چبھن ہوگی تو میں سب سے پہلے اپنے ایک فنکار دوست کے پاس جا کر کہوں گا "دوست! میں آج دکھی ہوں بتاؤ تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟" —— اور آج تم دکھی ہو کیا تم مجھے اپنا دکھ درد نہیں بتاؤ گے —— مجھ پر اعتماد نہیں کرو گے؟ شالی آغا! کہو!

(شالی آغا احمد عارف کو گھور گھور کر دیکھنے لگتے ہیں)

مجھ سے اپنا زخم چھپاؤ نہیں —— شاید میں مرہم نہ لا سکوں مگر تمہاری تکلیف ایک حد تک ضرور کم کر دوں گا۔

شالی آغا: تم کیا سمجھتے ہو مجھے کیا دکھ ہے؟

احمد عارف: اگر یہ بات مجھے معلوم ہوتی تو پھر تم سے یہ نہ پوچھتا کہ ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ تمہیں محبت میں ناکامی ہوئی ہے۔

شالی آغا: ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

احمد عارف: تو پھر؟

(شالی آغا خاموش رہتے ہیں)

پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے شالی؟

شالی آغا: ناکامی تو اس صورت میں ہو سکتی ہے جب دو ہستیوں کو آپس میں محبت ہو اور جب صورتِ حال یہ ہو کہ دونوں کو ایک دوسرے کا علم ہی نہ ہو تو کامیابی اور ناکامی کیا ہو سکتی ہے؟

احمد عارف: سمجھ رہا ہوں بتاتے جاؤ۔

شالی آغا (دونوں ہاتھ پیشانی پر سے لے جاتے ہوئے اور بالوں پر آہستہ آہستہ پھیرتے ہوئے):

کچھ مدت ہوئی گاڑی سے اترتے وقت پلیٹ فارم پر میں نے ایک لڑکی کی جھلک دیکھی تھی —— جانے اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا

جیسے میرے خواب اسی لڑکی سے رنگ و نور حاصل کرتے رہے ہیں ــــ وہ صرف ایک جھلک دکھا کر میری نظروں سے غائب ہو گئی۔ انتہائی کوشش کے باوجود میں اسے وہاں دوبارہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے بعد میں نے اسے ایک موسیقی کی محفل میں دیکھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو وہ گا رہی تھی۔ محفل ختم ہو گئی تو میں نے اس کا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

(شالی آغا خاموش ہو جاتے ہیں۔ احمد عارف انہیں بڑے غور سے دیکھ رہا ہے)

یہ ہستی میرے تصورات کی دنیا میں سانس لینے لگی ــــ میں اسے ڈھونڈھنے لگا۔ موسیقی کی محفلوں میں، ریلوے پلیٹ فارم پر، کلبوں میں، سنیما گھروں میں ــــ مگر کہیں بھی اس کی جھلک نہیں دیکھ سکا۔

احمد عارف: تو اس مایوسی نے تمہارے ذہن پہ اثر ڈالا ہے۔

شالی آغا: میں سمجھ چکا ہوں کہ اسے زندگی کے آخری سانس تک بھی نہیں دیکھ سکوں گا!

احمد عارف: ارادے کی شکست نے مایوسی کا بھیانک روپ اختیار کر لیا ہے اور تم اپنے فن سے بھی بیزار ہو گئے ہو۔!

شالی آغا: جو چاہو سمجھ لو ــــ میں نے حقیقت بتا دی ہے تمہیں!

(احمد عارف سر جھکا کر کرسی میں بیٹھ جاتا ہے۔ شالی آغا خاموش کھڑے رہتے ہیں پھر کوچ میں یوں بیٹھ جاتے ہیں جیسے گر پڑے ہوں ــــ تین چار لمحے یہ حالت رہتی ہے احمد عارف کرسی سے اٹھتا ہے اور شالی آغا کے پاس جاتا ہے)

احمد عارف: میں مایوس نہیں ہوں شالی!

(شالی آغا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہیں)

میں مایوس نہیں ہو سکتا! تم ہمت ہار چکے ہو ـــــ اب میں کوشش کروں گا!

شالی آغا: تم!

احمد عارف: جانتے ہو میری ساری زندگی طرح طرح کی تقریبات میں گذری ہے۔
ہزاروں لڑکیاں میرے سامنے آئی ہیں اور چلی گئی ہیں ـــــ تم بتاتے ہو وہ لڑکی
گا رہی تھی تو پھر میں نے اسے ضرور کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا اور ممکن ہے میں اسے
جانتا بھی ہوں۔

شالی آغا: تمہاری نظریں میری نگاہیں نہیں بن سکتیں عارف!

احمد عارف: یہ بالکل درست ہے۔ میری نظریں اسے نہیں پہچان سکتیں مگر تمہارا
فن تو میری رہنمائی کر سکتا ہے نا!

شالی آغا: وہ کیونکر؟

احمد عارف: شالی! یہ لڑکی اگر زندہ ہے تو ضرور تمہارے سامنے آجائے گی ـــــ
ممکن ہے تم اسے پالو اور تمہارا فن پھر زندہ ہو جائے مگر اس سے پہلے تمھیں اپنے
فن سے کام لینا ہوگا۔

شالی آغا: کیا چاہتے ہو تم!

احمد عارف: تمہارے دل کی گہرائیوں میں جو نقوش محفوظ ہیں انہیں کینوس پر لے آؤ۔

تاکہ جب میں اسے تلاش کروں تو اس کے خد و خال میرے ذہن میں ہوں۔

اور جیسے ہی وہ سامنے آئے اسے فوراً پہچان لوں!

شالی آغا: یہ ممکن نہیں عارف!

احمد عارف: تو پھر بتاؤ ہزاروں لڑکیوں میں سے میں اس لڑکی کو کیسے الگ کر سکتا

ہوں ——! (بڑی ملائمت سے) دیکھو دوست! ایک مرتبہ برش ہاتھ میں لے لو۔

تمہاری محبوبہ کے خد و خال خود بخود کینوس پر آ جائیں گے! ایک مرتبہ دیکھو تو ناامید

ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں تمہیں تمہارا گوہر مراد مل جائے گا!

اس کا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں!

(شالی آغا خاموش رہتا ہے —— پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(یہ منظر بھی اسی کمرے میں وقوع پذیر ہوتا ہے جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ فرق

صرف یہ ہے کہ جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو شالی آغا کمرے کے وسط میں ایزل کے

پاس کھڑے ہیں۔ ایزل پر ایک نہایت خوبصورت لڑکی کی تصویر پڑی ہے۔ یہ تصویر

ابھی پوری طرح مکمل نہیں ہوئی!

قریب ایک سٹول پر رنگوں کے ڈبے پنسلیں اور برش وغیرہ پڑے ہیں۔

شالی آغا تصویر کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ہاتھ میں برش ہے۔

احمد عارف آتا ہے۔

شام کا وقت)

احمد عارف : بہت خوب !

شالی آغا (نگاہیں تصویر پر جمائے) : عارف ! تم نے کہا تھا جیسے جیسے یہ خطوط روشن ہوتے جاتے ہیں تمہارے ذہن میں بھی کسی لڑکی کے خدوخال ابھرتے جاتے ہیں !

احمد عارف : یہ درست ہے، میں نے کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں ۔

شالی آغا : تمہیں کچھ یاد آگیا ہے ۔

احمد عارف : شالی ! بھولی بسری یاد تو ایک ٹوٹا ہوا ستارہ ہے جو فضا کے بسیط کے کسی دور دراز گوشے میں جا کر غائب ہو جاتا ہے ۔

شالی آغا : پھر تم اسے ڈھونڈو گے کیسے ؟

احمد عارف : ستارہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے مگر اپنے پیچھے روشنی کی ایک باریک لکیر سی ضرور چھوڑ جاتا ہے ـــــ مجھے یاد پڑتا ہے یہ خدوخال میں نے ایک لڑکی کے چہرے میں دیکھے تھے ۔ یہ لڑکی ایک مرتبہ مس گڈوانی کی سوسائٹی میں گانے کے لئے آئی تھی ۔ مس گڈوانی یقیناً اسے جانتی ہو گی ! خیال ہے یہ وہی لڑکی ہے جو گانے کے بعد اپنی سہیلیوں کے ساتھ چائے پینے کے لئے نیچے لان میں آگئی تھی ۔ سُرخ ساری تھی اس کی، ہاتھ میں مچھلی کی شکل کا پرس تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں ـــــ بالکل تمہاری تصویر جیسی ـــــ اور پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ

بھی ایسی ہی ـــــ مونالزا کی پُراسرار مسکراہٹ جیسی ـــــ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تمہارے تصورات کی ملکہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں ۔!

شالی آغا (آواز میں مسرت کی تھرتھراہٹ) : واقعی!

احمد عارف : بالکل تمہاری تصویر! خوش قسمتی یہ ہے کہ اسے فنونِ لطیفہ سے انتہائی دلچسپی بھی ہے ۔

شالی آغا : میرا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا تھا عارف! جو لڑکی میرے خوابوں کو جگمگا دے اسے فنونِ لطیفہ سے ضرور دلچسپی ہونی چاہیئے ۔

احمد عارف : اس میں کیا شک ہے؟

شالی آغا : تصویر آج رات مکمل ہو جائے گی ۔!

احمد عارف : شالی! جب سے تم نے تصویر پر کام شروع کیا ہے آرام نہیں کیا ۔ اب تم آرام کر لو ۔ تصویر ایک دو دن میں مکمل ہو جائے گی! ـــــ اتنی عرق ریزی کی ضرورت نہیں شالی!

شالی آغا : عارف! تم نہیں جانتے میرے دل کی کیا کیفیت ہے ۔ جی چاہتا ہے یہ تصویر جلد مکمل کر دوں ـــــ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے ۔

احمد عارف : ایک تصویر کیا ـــــ جانے کتنے شاہکار مکمل کرو گے اپنی زندگی میں!

شالی آغا : میں کچھ یوں محسوس کر رہا ہوں جیسے وہ ـــــ میرے خوابوں کی ملکہ دبے پاؤں میرے کمرے میں چلی آئی ہے ۔ شام کے ملگجی اندھیرے میں اس کی

خوبصورت آنکھوں کے چراغ روشن ہیں ـــــ اس کے ہونٹوں سے دلآویز مسکراہٹ کے پھول گر رہے ہیں ـــــ اس کے شب رنگ گیسوؤں کی خوشبو فضا میں بکھرتی جا رہی ہے ـــ اس کے سانسوں کی حرارت سے میرے خون کی گردش تیز ہو گئی ہے ـــــ!

(احمد عارف جانے لگتا ہے)

میرا دل دھڑکنے لگا ہے تیزی کے ساتھ۔ عارف!

(شالی آغا مڑکر دیکھتے ہیں۔ عارف وہاں موجود نہیں)

اوہ تم چلے گئے ـــــ! بار بار وہی باتیں جو کہتا ہوں! پر تم کیا جانو کیا کیفیت ہے میرے دل کی!

(شالی آغا برش رنگ میں ڈبوتا ہے اور پردہ گرتا ہے)

تیسرا منظر

(جب پردہ اٹھتا ہے تو سٹیج خالی نظر آتی ہے۔

کمرے کے درمیان نیلے رنگ کا پردہ جو ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسری طرف کیا ہے یہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا۔ رات کا ابتدائی وقت، کمرے کے بلب روشن ہیں۔

دروازے کا پردہ ہٹتا ہے ـــــ احمد عارف اور شالی آغا آتے ہیں۔ شالی آغا کے

چہرے سے بے تابی کے اثرات نمایاں ہیں)

شالی آغا: کہاں ہے؟

احمد عارف: چند لمحے ٹھہر جاؤ۔ تمہاری امیدوں کی رانی تمہارے سامنے آجائیگی!

شالی آغا: آ رہی ہے کیا؟

احمد عارف: آ چکی ہے دوست!

شالی آغا: کہاں ہے پھر؟

احمد عارف (پردے کی طرف اشارہ کرکے): اس کے پیچھے۔

شالی آغا: یہاں؟

(شالی خرطہ بیتابی میں پردہ ہٹاتا ہے۔ ایزل پر وہی تصویر موجود ہے جو شالی آغا نے بنائی ہے۔ شالی آغا اِدھر اُدھر دیکھتا ہے)

کہاں ہے؟

احمد عارف: حیرت ہے اپنے خوابوں کی ملکہ کو بھی نہیں پہچانتے۔ (تصویر کی طرف اشارہ کرکے) یہ کون ہے؟

شالی آغا: یہ — میری پینٹنگ —؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو! — یہ کیا مذاق ہے یہ کیسا تمسخر کر رہے ہو مجھ سے عارف! — عارف!!

احمد عارف: یہ مذاق نہیں شالی!

شالی آغا: تو پھر کیا ہے؟

احمد عارف (بڑی ملائمت سے) : شالی! تم جس لڑکی کو اپنانا چاہتے ہو اس کا وجود دنیا کی وسعتوں میں کہیں بھی نہیں ہے۔ یہ وہ نقوش نہیں جو تم نے کسی اجنبی لڑکی کے چہرے میں دیکھے تھے۔

میرے دوست! یہ نقوش تمہارے اپنے تصورات کی پیداوار ہیں — تم نے مدت ہوئی ایک خاکہ دیکھا تھا۔ اس خاکے کے خطوط خود تم نے دلکش بنائے ہیں — ان میں طرح طرح کے رنگ خود تم نے بھرے ہیں — یہ لڑکی تمہارے سینے کی گہرائیوں میں سو رہی تھی — تم اسے رنگوں کی خارجی دنیا میں لے آئے ہو! — جس ہستی کی تخلیق میں تم نے اپنے خون کی رنگینی، اپنے پسینے کی درخشانی اور اپنے خوابوں کی آب و تاب صرف کی ہے وہ یہاں کہیں بھی نظر نہیں آسکتی — یہ تمہارا آئیڈیل ہے — اور فن کار کی کوشش اور آئیڈیل کے درمیان ہمیشہ مسافتیں پھیلی رہتی ہیں — یہ مسافتیں کبھی ختم نہیں ہوتیں — کبھی ختم نہیں ہو سکتیں!

(شالی آغا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر احمد عارف کو دیکھ رہا ہے)

تم سمجھتے ہو میں نے جھوٹ بولا ہے — میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ یہ درست ہے۔ تم ایسا سمجھ سکتے ہو — لیکن سوچو اگر میں ایسا نہ کرتا تو دنیا تمہارے کتنے بڑے شاہکار سے محروم رہ جاتی — یہ شاہکار کئی آنے والے شاہکاروں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا — آج تمہارے خیالوں کے برفستان میں نئی امنگوں اور نئی ترنگوں کا لاوا پھوٹ نکلا ہے۔ تمہارا برش حرکت کرتا رہے گا اور ہمیں

نئی نئی تصویریں ملتی رہیں گی!

(شالی آغا ٹکٹکی باندھ کر تصویر کو دیکھتے رہتے ہیں پھر دھم سے زمین پر گر پڑتے ہیں۔)

احمد عارف: "شالی آغا" کہہ کر ان کی طرف جھکتا ہے۔ ان کا بازو پکڑ کر بار بار "شالی آغا! شالی آغا!" پکارتا ہے۔ سلیم آتا ہے)

سلیم: کیا ہوا؟

احمد عارف (آنکھوں میں آنسو، آواز بھرائی ہوئی): سلیم! یہ شاہکار ہمارے شالی آغا کا آخری شاہکار ہے۔

انصاف

افرادِ تمثیل

میر صاحب

فیروز

اسحاق رضوی

غفور

استاد

کسی بلڈنگ کی سب سے نچلی منزل کا ایک ایسا کمرہ جو کسی طرح بھی رہائش کے قابل نہیں ہے، دیواروں پر شاید کبھی سفیدی ہوئی ہی نہیں۔ کسی دیوار میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کمرے میں دن کے وقت بھی شام کا سا عالم چھایا رہتا ہے۔ موجودہ کرایہ دار کے آنے سے پیشتر یہ کمرہ یا تو گودام کی صورت میں استعمال ہوتا تھا یا موٹر گیراج کے طور پر یا ممکن ہے ہمیشہ خالی رہتا ہو۔ کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی۔

اس جگہ تماشائیوں کو جو چیز سب سے عجیب اور سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ پیتل کی ایک تھالی ہے جو چھت سے بندھی ہوئی رسّی کے آخری سرے سے لٹک رہی ہے۔ تھالی کے کنارے سے چھید کر کے اس میں سے رسّی گزار دی گئی ہے اور یوں تھالی کے اس طرح لٹکے رہنے کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔

دائیں دیوار میں کونے سے ذرا اِدھر لکڑی کی ایک چھوٹی سی سیڑھی کے اوپر ایک دروازہ ہے جس کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ کمرے میں آنے جانے کے لئے صرف یہ ایک

دروازہ ہے۔ دروازے کے اُس طرف کیا ہے، یہ معلوم نہیں ہوتا۔

کمرے کی طرح کمرے کا سامان بھی ادنٰے درجے کا ہے۔ سامنے کی دیوار پر دو ایک فلموں کے رنگین پوسٹر اور فلمی رسالوں سے نکالی ہوئی ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں چسپاں کی گئی ہیں۔ اسی دیوار میں ایک کھونٹی سے کچھ کپڑے بھی لٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ فرش پر ایک میلی کچیلی دری بچھی ہے جس کے ایک سرے پر ایک بوسیدہ تکیہ بھی پڑا ہے۔ تکیے کے کئی حصّوں سے روئی باہر نکل آئی ہے۔ دری کے ایک طرف ایک کھجوری پنکھا پڑا ہے —— تکیے کے پاس ایک صراحی اور صراحی کے اوپر ایلومینیم کا گلاس دھرا ہوا ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو اسٹیج پر کوئی شخص نظر نہیں آتا۔ دو تین لمحوں کے بعد فیروز دروازے پر نمودار ہوتا ہے اور اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ نیچے اترنے لگتا ہے نیچے اتر کر وہ تپائی کی طرف قدم اٹھانے لگتا ہے۔ قدم اٹھاتے وقت اس کے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ مگر وہ کیا کہہ رہا ہے یہ سنائی نہیں دیتا۔ یقیناً وہ فقرے دہرا رہا ہے جو اسے ابھی اپنے ساتھی کے آنے پر کہنے ہیں۔

فیروز پینتیس چالیس برس کا آدمی ہے۔ مضبوط اور گٹھا ہوا جسم۔ ملیشیا کی قمیص اور لٹھے کی شلوار میں ملبوس، قمیص کا گریبان کھلا ہوا، آستینیں کہنیوں تک چڑھا رکھی ہیں۔ لب ولہجہ —— خالص پنجابی۔ چونکہ اَن پڑھ ہے اس لئے اکثر و بیشتر پنجابی کے الفاظ بے تکلفی سے استعمال کرتا رہتا ہے۔

لفافی کے پاس جاکر وہ خود بخود گرج کر کہتا ہے " با ادب با ملاحظہ ہوشیار، حضور باشا تشریف لاتے ہیں "

یہ الفاظ کہنے کے بعد اپنا سر اثبات میں اس انداز سے ہلاتا ہے جیسے وہ اپنے پارٹ سے مطمئن ہے۔ دروازے کی طرف دیکھتا ہے اور اونچی آواز سے کہتا ہے:

"آوی ناں یار میر صاب کیا کر رہے ہو؟"

میر صاحب سیڑھی پر ظاہر ہوتا ہے۔ پچاس برس کا دھان پان آدمی ٹخنے کا تنگ موری والا پاجامہ اور ململ کا سفید براق کرتہ پہنے ہوئے ___ سر پر دو پلّی، ایک کلّے میں پان دبا رکھا ہے۔ میر صاحب فیروز کی طرف آتا ہے۔

میر صاحب (لہجہ یوپی والوں کا) یہ غل کیا مچا رکھا ہے حضرت!

فیروز: کر کیا رہا لفافو ___؟ اُدھر باشا کا دربار لگ رہا ہے ___ لگ گیا ہے ناں؟

میر صاحب: استاد ابھی تیار نہیں ہوا۔ ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ پارٹ یاد کر لیا ہے تم نے؟ نیا ڈراما ہے آج، یونہی ہوا ہی نباہی نہ بک دینا۔

فیروز: او بادشاہوا پاٹ کا کیا ہے۔

میر صاحب: سناؤ تو، دیکھوں کیا کہتے ہو!

(فیروز کی گردن اکڑ جاتی ہے، دایاں ہاتھ فضا میں بلند کرتا ہے)

فیروز: سب کچھ یاد ہے (لہجہ بدل کر) با ادب با ملاحظہ ___ با ملاحظہ ___ یار آگے کیا ہے؟

میر صاحب: بھول گئے نا۔ بڑے تیس مار خاں بنے پھرتے تھے۔ کہو باادب باملاحظہ ہوسیار۔

فیروز: ہوسیار؟

میر صاحب: ارے ہوسیار نہیں، کہو ہوسیار!

فیروز: یار ہوسیار ہی تو کہہ رہا ہوں۔

میر صاحب: ہوسیار کہو اسکہ والی سین کے ساتھ۔

فیروز: ہوشیار!

میر صاحب: ہاں بات بنی نا۔ بڑی جلدی بھول جاتے ہو۔ ہمیں دیکھو کیا مجال جو ایک لفظ اِدھر اُدھر ہو جائے یا بھول جائے۔ اللہ قسم ایک بار اسکرین پر آجاؤں تو مزا آجائے۔ آج ہمارا پارٹ دیکھنا۔

فیروز: میں نے کہا میر صاحب! وہ ڈنڈا کہاں ہے؟

میر صاحب: کیسا ڈنڈا؟

فیروز: (تھالی کی طرف اشارہ کر کے) بجاؤ گے کس سے؟

میر صاحب: اوہو یہ تو سوچا ہی نہیں (دری کی طرف اشارہ کر کے) استاد کے پنکھے سے کام چل جائے گا۔

(میر صاحب دری کے پاس جاکر تکیے پر سے پنکھا اٹھا لیتا ہے اور پھر اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے)

فیروز (ڈھول مارتے ہوئے): واہ کیا شاندار ڈنڈا لائے ہو میر صاحب!

میر صاحب: بڑے ہنہ چھٹ بنے پھرتے ہو (شانہ ہلاتے ہوئے) کسی دن جلال آگیا ہمیں تو دانت توڑ ڈالیں گے۔ ہاں یاد رکھو! واللہ سچ عرض کرتے ہیں ہمیں کبھی کبھی جلال بھی آجاتا ہے۔

فیروز: اچھا یار! توڑ ڈالنا ہمارے دند۔ پر پنکھا تھالی پر زور سے نہ مارنا۔ استاجی کا ہے۔

میر صاحب (پنکھا تھالی پر مارتے ہوئے): بس ایسے ٹھیک رہے گا۔

(استاد سیڑھی پر آتا ہے، درمیانہ قد قامت کا شخص، رنگ گندم گوں، نقش بیٹھے بیٹھے سے، ناک کے نیچے چھوٹی چھوٹی مونچھیں، پاجامہ میلا، قمیص میں پیوند لگے ہوئے سر پر ایک پرانی جناح کیپ۔ استاد سیڑھی سے اتر کر دری کی طرف جاتا ہے اور تکیے پر بیٹھ جاتا ہے)

فیروز: شروع کرو یار۔

میر صاحب: اچھا شروع کرتا ہوں۔

(میر صاحب پنکھے کی ڈنڈی تھالی پر مارتا ہے)

فیروز (گرج کر): کون ہو تم؟

میر صاحب: ایک فریادی!

فیروز: کیا چاہتے ہو؟

میر صاحب: (وہی تھالی کی طرف اشارہ کرکے) جو اس عدلِ جہانگیری کا فرض ہے۔

(استاد اٹھتا ہے اور ان کی طرف آہستہ آہستہ قدم اٹھانے لگتا ہے)

فیروز (بلند آواز سے): با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ بادشاہ جہانگیر تشریف لاتے ہیں۔

استاد (آواز میں دبدبہ): کس نے پکارا ہمیں؟

میر صاحب (سر جھکا کر، بڑے ادب سے): عالی جاہ! اس غلام نے۔

استاد: کیا چاہتے ہو۔ مابدولت کے حضور میں آنے کا کیا مقصد ہے۔ بولو! مابدولت تمہاری بات سننے کے منتظر ہیں۔

میر صاحب: عالی جاہ! میں بڑا دکھی ہوں۔

استاد: کیا دکھ پہنچا ہے تمہیں، ہماری حکومت میں۔ کس شخص نے تمہیں دکھ دینے کی جرأت کی، کہو!

میر صاحب: عالی جاہ! اس غلام کو امید ہے فرماں روائے ہندوستان انصاف کرے گا۔

(دو تین لمحوں کی خاموشی)

استاد (مدھم آواز میں): انصاف!

(استاد خاموش ہو کر ٹکٹکی باندھ کر تھالی کو دیکھتا ہے اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں بازو میں قمیص کے پیوند پر پھیرنے لگتا ہے۔ دو تین لمحوں کے بعد سر گود میں ہٹا لیتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے۔)

میر صاحب اور فیروز حیرت سے استاد کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

استاد آہستہ آہستہ دری کی طرف جانے لگتا ہے، دری پر بیٹھ جاتا ہے۔ میر صاحب اور فیروز جلدی سے ادھر آجاتے ہیں، میر صاحب استاد کو پنکھا جھلنے لگتا ہے فیروز پاس بیٹھ جاتا ہے)

میر صاحب: کیا ہوا اُستاد؟

استاد: کچھ نہیں۔

فیروز: بات کیا ہے استاد جی؟

استاد: ...... آئندہ یہ کھیل کبھی نہیں ہوگا۔

فیروز: اچھا اُستاد جی، پانی لاؤں؟

استاد: ہاں ایک گلاس ٹھنڈا پانی!

فیروز: (چٹکی بجاتے ہوئے): یوُں لو۔

(فیروز صراحی سے گلاس بھرتا ہے اور استاد کو دیتا ہے۔ استاد گلاس ہاتھ میں لے کر یونہی بے حس و حرکت سا بیٹھا رہتا ہے)

میر صاحب: استاد! طبیعت خراب ہو گئی ہے کیا؟ ایک پان بنا کے لاؤں چاندی کا ورق لگا کر؟

استاد: نہیں بھئی۔

فیروز: میر صاب! یار اپنے حکیم صاب سے ایک گلاس ٹھنڈا ٹھنڈا شربت

لے آؤ -

استاد: اونہوں - (پانی کا گلاس ہونٹوں سے لگا لیتا ہے) ٹھیک ہے طبیعت میری، شربت وغیرہ کی ضرورت نہیں -

(دروازے کے باہر سے ایک آواز آتی ہے "میر صاحب!")

میر صاحب: کون ہے، آئیے صاحب

(اسحاق رضوی سیڑھی پر آتا ہے)

اسحاق رضوی: اندر آنے کی اجازت ہے؟

فیروز: آؤ بادشاہو!

اسحاق رضوی (پیچھے مڑ کر): آؤ غفور!

(اسحاق رضوی سیڑھی سے اترتا ہے - اس کے پیچھے غفور آتا ہے اسحاق رضوی دراز قد آدمی ہے - پتلون اور بش شرٹ میں ملبوس - عمر ۲۰ کے لگ بھگ ہو گی غفور نوجوان ہے، لباس پتلون اور سپید قمیص، سر پر سولا ہیٹ ــــــ دونوں دری کی طرف آتے ہیں)

میر صاحب: بیٹھئے صاحب!

اسحاق رضوی (ایک طرف بیٹھتے ہوئے): شکریہ!

(غفور بھی بیٹھ جاتا ہے اور ہیٹ اتار کر ایک طرف رکھ دیتا ہے)

میر صاحب: آپ استاد سے ملنے آئے ہیں یا اس خاکسار سے؟

غفور: دونوں سے (فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے) بلکہ تینوں سے!

فیروز: اچھا جی!

پیر صاحب: معلوم ہوتا ہے آپ استاد سے ملنے آئے ہیں۔

اسحاق رضوی: یہی سمجھ لیجئے۔

(استاد اس دوران خاموش اور بے نیاز بیٹھا رہتا ہے۔ گلاس ابھی اس کے ہاتھ میں ہے)

غفور: یہی ہے وہ کمرہ، جہاں ملک کا اتنا بڑا آرٹسٹ رہتا ہے۔

پیر صاحب: جی یہ خاکسار کا کمرہ ہے، استاد میرے مہمان ہیں —— فیروز ساتھ والے کمرے میں رہتا ہے۔ خاکسار کی سگریٹ پان کی دکان ہے۔ آپ نے دیکھی ہوگی وہ نوروز سینما کے دائیں طرف کراکری کی بڑی سی دوکان کے عین بالمقابل۔

فیروز: اور میری دوکان بھی دیکھی ہوگی۔ تمباکو اور چلموں کی دوکان ہے۔ کبھی خدمت کا موقع دیجئے۔ ایسا فسٹ کلاس تمباکو سارے شہر میں نہیں ہوگا۔

پیر صاحب: کیا ٹر ٹر لگا رکھی ہے تو نے!

فیروز: یار! میں اپنی کمپنی کی مشہوری نہ کروں تو اپنے پان کی مشہوری کر رہے ہیں ——؟

(اسحاق رضوی اور غفور دونوں بے اختیار ہنس پڑتے ہیں)

اسحاق رضوی (استاد کی طرف اشارہ کرکے) : ہم تو ان کا دیدار کرنے آئے ہیں، چند روز ہوئے ہیں اور غفور اُدھر سے گزر رہے تھے — (میر صاحب کی طرف دیکھ کر) آپ کی وہ دکان پر نظر پڑ گئی۔ یہ وہیں کھڑے تھے — میں نے فوراً پہچان لیا۔

فیروز : ملک کے اتنے بڑے فنکار کو پہلی نظر ہی میں پہچان نہ سکیں یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

اسحاق رضوی : ان کی حالت دیکھ کر (آواز میں درد پیدا کرتے ہوئے) بڑا دکھ ہوا۔ اتنا بڑا ایکٹر اور اس حالت میں۔ یہ مردہ پرست ملک ہے لوگ قبروں پر پھول چڑھاتے ہیں مگر —— (آہ بھر کر خاموش ہو جاتا ہے)

غفور : میں نے ان کی ساری کی ساری فلمیں دیکھی تھیں۔ جب بھی کوئی نئی فلم آتی تھی سب سے پہلے دیکھتا تھا۔ اسکول میں پڑھتا تھا اس زمانے میں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ اس وقت ابا کی شیروانی سے کچھ نہ کچھ اڑا لیتا تھا۔ (ہنستا ہے)

اسحاق رضوی : خوب!

(دونوں ردِ عمل معلوم کرنے کے لئے استاد کی طرف دیکھتے ہیں،

استاد غیر متاثر نظر آتا ہے)

غفور (تھالی دیکھ کر) : میر صاحب! یہ کیا ساٹنس ہے؟

میر صاحب: کچھ نہیں صاحب! بس کبھی دل بہلانے کے لئے کسی فلم کا پارٹ کر لیتے ہیں۔ آج ہم نے عدلِ جہانگیری کا ایک سین کیا تھا۔

فیروز: ذرا شغل میلہ ہو جاتا ہے اور کیا۔

غفور: خوب!

اسحاق رضوی (غفور سے): بھئی غفور! جس مقصد کے لئے آئے ہیں وہ اب کہہ دینا چاہیئے۔

غفور: جی ہاں۔

اسحاق رضوی (استاد سے مخاطب ہو کر): بات یہ ہے جناب، ہم نے ایک سوسائٹی بنائی ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ ایک ڈراما کھیلیں جس کی آمدنی آپ کے لئے وقف کر دی جائے اور آپ بھی اس ڈرامے میں حصہ لیں۔ ہم اس کی بڑے اعلیٰ پیمانے پر پبلسٹی کریں گے۔

(استاد نفی میں سر ہلاتا ہے)

غفور: آپ کو پسند نہیں کیا؟

استاد: جی نہیں۔

اسحاق رضوی: مگر دیکھئے، میں جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ آپ یقیناً جانتے ہیں۔

استاد: جانتا ہوں ——— یہی کہ میری حالت بہت خراب ہے ——— ناگفتہ بہ ہے۔

اسحاق رضوی : آپ کے عقیدت مندوں کا بھی کچھ فرض ہے۔

استاد : کوئی فرض نہیں۔

غفور : ہم لوگ آپ کے عقیدت مند ہیں۔

استاد : میں آپ کا شکر گذار ہوں۔

غفور : دیکھئے آپ ——

اسحاق رضوی : غفور! مجھے بات کرنے دو، اور دا استاد سے اسو سائٹی کے ممبروں

کی دلی خواہش ہے کہ وہ آپ کے لئے ایڈ مہیا کریں۔

استاد : میں ایڈ کے بغیر بھی زندہ ہوں۔

اسحاق رضوی : اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کو ایڈ کی کوئی خاص ضرورت نہیں

مگر ہم چپ چاپ کیسے آپ کی حالت کا تماشا دیکھ سکتے ہیں؟ اتنا بڑا فن کار اور

یوں زندگی بسر کرے، تف ہے اس ملک پر۔

استاد : میں نے اپنا ہاتھ آج تک کسی کے سامنے نہیں پھیلایا —— اور کبھی

پھیلاؤں گا بھی نہیں۔

اسحاق رضوی : آپ ہاتھ ہرگز نہیں پھیلائیں گے۔

(میر صاحب اور رفیروز بڑی دل چسپی سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں)

استاد : میں صرف آپ کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔

میر صاحب : استاد! اسٹیج پر آجائیں تو کیا حرج ہے؟ یہاں بھی تو کام ہوتا ہی رہتا ہے۔

استاد: کام آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔

میر صاحب: ان کی بات مان لیجئے استاد! بڑی توقع لے کر آئے ہیں۔

اسحاق رضوی: ہم تو خادم ہیں۔

استاد: مجبور ہوں۔

فیروز: چھوڑو نا یار! مان جا میرے استاجی!

استاد: تم نہیں سمجھتے فیروز۔

فیروز: سب ٹھیک ہے، میرے یار! مان جاناں اب (استاد سے لپٹ کر)
مان جا یار۔

استاد: ارے یہ کیا — فیروز!

فیروز: مان جا!

استاد: ارے یہ کیا طریقہ ہے — اچھا مجھے چھوڑ تو دے۔

فیروز (استاد کو چھوڑتے ہوئے اسحاق رضوی سے): بس استاد مان گیا ہے۔

(دو تین لمحے خاموشی)

استاد: ایک شرط ہے۔

اسحاق رضوی اور غفور (ایک ساتھ): جی فرمائیے!

استاد: اسٹیج پہ جو کچھ پیش کرنا ہے وہ میں خود کروں گا۔ آپ کی سوسائٹی دخل
نہیں دے گی۔

اسحاق رضوی: قطعاً دخل نہیں دے گی۔

فیروز (خوش ہو کر استاد سے لپٹتے ہوئے): واہ میرے شیر!

میر صاحب: (فیروز کو ہٹاتے ہوئے) پیچھے ہٹ سیر کے بچے!

(اسحاق رضوی، غفورہ اور میر صاحب ۔۔۔ تینوں یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہے ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(نئے منظر کا پردہ آہستہ آہستہ اٹھتا ہے۔ رات کا وقت

اسٹیج پر محل کا ایک بیرونی حصہ دکھایا گیا ہے۔

مغربی سمت ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک محل کی پرہیبت دیوار کھڑی ہے۔ اس دیوار کے وسط میں ایک دروازہ ہے جو اس وقت کھلا ہے۔ دروازے میں فیروز ایک چوکیدار کی حیثیت میں بڑی شان سے کھڑا ہے۔ لباس پاجامہ، عبا، کمرتا، سر پہ پگڑی، کمر میں پٹکہ، میان کمر سے لٹکی ہوئی جس میں چھپی ہوئی تلوار کا سنہری دستہ نمایاں ہے۔

دروازے کے عین سامنے، تھوڑے سے فاصلے پر، ایک سنہری زنجیر سے پیلے رنگ کا ایک تابناک اور بھاری بھرکم گھنٹہ لٹک رہا ہے۔ گھنٹہ کے پاس ہی ایک اور زنجیر کا سرا دکھائی دے رہا ہے۔ اس زنجیر کو کھینچ دینے سے گھنٹہ کی بلند ٹن ٹن چاروں طرف گونج اٹھتی ہے۔

شمال میں تاحدِ نظر شاہی باغ کے پودے، فوارے وغیرہ دکھائی دے رہے ہیں مشرقی جانب کوئی سڑک ہے۔

میر صاحب مشرقی جانب سے آتا ہے۔ لباس وہی جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب اس نے پگڑی بھی باندھ رکھی ہے۔

میر صاحب تیزی سے آکر زنجیر کھینچتا ہے۔ گھنٹہ کی ٹن ٹن گونجنے لگتی ہے۔ وہ گھنٹہ کے ایک طرف ہو کر مؤدب انداز میں کھڑا ہو جاتا ہے)

فیروز (بڑے رعب سے): کون ہو تم؟

میر صاحب: جو آدمی یہاں آکر زنجیر کھینچے وہ کون ہو سکتا ہے؟

فیروز: بادشا آرام کر رہے ہیں۔

میر صاحب: یہ زنجیر ہمیں یہ نہیں بتاتی کہ جہاں پناہ اس وقت آرام کر رہے ہیں یا کام کر رہے ہیں —— یہ زنجیر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کوئی فریادی اسے جس وقت بھی کھینچے گا، ظلِ سبحانی ضرور آجائیں گے۔ تم چوکیدار ہو اپنا فرض ادا کرو۔

فیروز: ہم یہ خبر نہیں دے سکتے۔

میر صاحب: کیوں؟

فیروز: اس کی اجازت نہیں ہے۔

میر صاحب: ہاں! اس کی اجازت نہیں ہے۔ کیوں کہ فریادی کی پکار سُن کر وہ خود آجاتے ہیں۔

(دونوں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ تین چار لمحے گذر جاتے ہیں۔ دونوں کچھ بے چین سے ہو جاتے ہیں۔

میر صاحب دوبارہ زنجیر کی طرف جانے لگتا ہے)

فیروز (دایاں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے): ٹھہر جاؤ ــــ استاذ ــــ توبہ میری جہاں پناہ آ رہے ہیں، با ادب با ملاحظہ ......

(حیرت سے فیروز اپنا فقرہ مکمل نہیں کر سکتا۔ استاد آتا ہے مگر شہنشاہی لباس میں نہیں بلکہ وہی لباس پہنے ہوئے جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے۔ فیروز اور میر صاحب دونوں حیران کھڑے ہیں۔ استاد آگے بڑھتا ہے)

استاد: کون ہے فریادی!

(دونوں خاموش ہیں)

کون ہے فریادی!

(اب کے بھی دونوں خاموش رہتے ہیں)

حیران ہو گئے ہو مجھے اس حالت میں دیکھ کر ــــ اس وقت مجھے جتنے لوگ دیکھ رہے ہیں سب کے سب حیران ہیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کے سامنے یہ ہو کیا گیا ہے۔ توقع تھی کہ گھنٹہ کی آواز سنتے ہی شہنشاہ ہندستان، ظلِ سبحانی جہانگیر ابنِ اکبر چمکتے دمکتے، شاہی لباس زیب تن کئے جلوہ افروز ہوں گے ــــ ان کے لباس کی تابناکی کے سامنے اسٹیج کی اس روشنی کا سیلاب بھی ماند پڑ جائیگا

اور وہ تجلّی بکھیرتے ہوئے للکار کر کہیں گے ـــــ "کہو فریادی تم کون ہو ـــــ کیا فریاد لے کر آئے ہو؟ ـــــ جس شخص نے بھی تم پر ظلم کیا ہے، وہ کوئی بھی ہو، کہیں بھی ہو، انصاف کے اٹل قانون کی زد سے بچ کر نہیں جا سکتا۔" مگر یہ کیا تماشا ہے ـــــ دیکھنے والے مغل شہنشاہ کی بجائے، مغل شہنشاہ کے مقام پر ایک چیتھڑے پہنے ہوئے شخص کو دیکھ رہے ہیں ـــــ یہ کیا تمسخر ہے ـــــ یہ کیسا عجیب تماشا ہے ـــــ

(دو تین لمحے خاموشی)

بادشاہ جہانگیر کا شہنشاہی لباس اپنی تمام جگمگاہٹیں لیے (مغربی سمت ہاتھ اٹھا کر) اسٹیج کے اس طرف پڑا ہے اور میں جو بھی ہوں اسی حیثیت سے یہاں آ گیا ہوں۔ آج تک میں نے اپنا دستِ سوال کسی کے سامنے نہیں پھیلایا۔ لیکن چاہنے والے چاہتے ہیں کہ میں بھی شہنشاہ جہانگیر بن کر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے تماشائیوں سے بھیک مانگوں۔ یہ مجھے منظور نہیں ہے۔ میں کسی طرح بھی برداشت نہیں کر سکتا ـــــ ایک تاریخی منصف بادشاہ کا روپ دھار کر میں کسی فریادی کی فریاد کیا سنوں جب کہ میرے اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں ہزاروں فریادیں تڑپ تڑپ کر ڈوب چکی ہیں۔ مجھ میں کسی مظلوم کی داستانِ غم سننے کا حوصلہ کیسے باقی رہ سکتا ہے جب کہ میں خود اپنے وجود میں ایک نہایت مظلوم ہستی کو سانس لیتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔

(دو تین لمحے خاموشی)

اس اسٹیج کی روشنیوں اور رسائیوں میں میں سالہا سال تک اپنی آنکھوں کا نور، اپنے دماغ کی اہلیت اور جسم کی توانائی اپنے فن پر قربان کرتا رہا ہوں۔ دن کا آرام، میری زندگی سے خارج ہوتا چلا گیا — راتوں کی نیند میری آنکھوں سے دور ہوتی گئی — گرمیوں کی جھلس دینے والی دوپہر کو کیمرے کی نگاہوں نے مجھے بوجھل لباس پہنے ہوئے دیکھا ہے — جاڑے کی منجمد کر دینے والی سردی نے اپنی تیز تیز سوئیاں میرے ایک ایک عضو میں چبھوئی ہیں — ایک مدت تک میرا فن تھکے ہوئے دماغوں کو سکون اور آرام کا پیغام دیتا رہا ہے۔ سالہا سال تک میری اداکاری لوگوں کے لئے سامانِ تفریح مہیا کرتی رہی ہے — میں نے اپنا دکھ درد بھول کر مضحکہ خیز حرکتیں کی ہیں تاکہ میرے سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں چہرے قہقہوں کے طوفان میں ڈوب جائیں۔ تھکاوٹ سے چور چور ہونے کے باوجود میں نے پوری پوری رات کام کیا ہے تاکہ تفریح ڈھونڈنے والے تفریح گاہوں سے مایوس نہ لوٹیں۔

(ذرا خاموشی)

لیکن یہ کیسا انصاف ہے کہ گذشتہ سات سال سے میں اپنے ایک پرانے ٹری دوست کی دوستی کا سہارا لے کر زندگی کے دن پورے کر رہا ہوں — کیا کبھی کسی کے دل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ایک فن کار — جسے کسی زمانے میں

ایک عظیم فن کار مانا جاتا تھا آج ایک موٹر گیراج میں سانس لیتی ہوئی لاش بن کر رہ گیا ہے؟ کیا کبھی کسی نے یہ بھی سوچا ہے کہ اس فن کار کو دو وقت کی روٹی بھی میسر ہوتی ہے یا نہیں —— ؟ سردیوں کی طویل راتوں میں اس کے پاس ایک لحاف بھی ہے کہ نہیں ہے —— ؟

یہ انصاف نہیں ہے کہ جو شخص بیس سال تک اپنا خون پسینہ فن کے لئے بہاتا رہا ہے اسے کوڑا کرکٹ کی طرح ایک گندی جگہ پر پھینک دیا جائے۔

(چیخ کر) یہ انصاف نہیں ہے۔ (زور سے چیخ کر) یہ انصاف نہیں ہے۔

(اور زیادہ چیخ کر) یہ انصاف نہیں ہے۔

میں انصاف کروں؟ —— ایک مشین کی طرح گھبرتے ہوئے لفظ اپنے منہ سے اُگل دوں —— جب کہ میرے روئیں روئیں سے نا انصافی، نا انصافی کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

(استاد کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگتی ہیں —— بدن رعشہ زدہ ہو جاتا ہے وہ گرنے لگتا ہے —— گھنٹہ تھام لیتا ہے —— فیروز اور میرہ صاحب "استاد استاد" کہتے ہوئے اسے سنبھالنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں —— مگر وہ گھنٹہ کے ساتھ ہی دھم سے فرش پر گرتا ہے۔ شور و غوغا کے درمیان پردہ جلدی سے گرتا ہے)

ستون

افرادِ تمثیل

انوری	ارشد کی بیوی
صغریٰ	انوری کی چھوٹی بہن
رشیدہ	ارشد کی بہن
خالد	انوری کا لڑکا
بانو	انوری کی لڑکی
اماں	انوری اور صغریٰ کی ماں

پہلا منظر

(اس تمثیل کے واقعات ایک ایسے کمرے میں رونما ہوتے ہیں جو عام کمروں کی بہ نسبت کچھ بڑا ہے اور گھر کے لوگ اپنا بیشتر وقت یہیں گذارتے ہیں۔ کمرے کی سب سے نمایاں چیز وہ کلاک ہے جو سامنے دیوار میں لگا مسلسل ٹک ٹک کر رہا ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو ہم اس کمرے میں خاندان کے جتنے افراد کو دیکھتے ہیں وہ سب کے سب کسی نہ کسی کام میں مصروف دکھائی دیتے ہیں اور یہ سب اپنے کاموں میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ سامنے دیوار کے ساتھ ایک چارپائی بچھی ہے جس پر کتابیں بکھری پڑی ہیں اور ربانو جس کی عمر سات آٹھ سال سے زیادہ نہیں، ایک ایک کتاب اٹھا کر اپنے بستے میں ڈال رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے بھائی خالد کو بھی دیکھتی جاتی ہے جو اس سے ڈیڑھ برس بڑا ہے اور جو اس وقت اس سے کچھ دور اپنی ربڑ کی گیند سے کھیل رہا ہے!

مشرقی دروازے کے پاس ایک چوبی میز کے اوپر صغریٰ کسی کپڑے پر بجلی کی استری پھیر

رہی ہے ـــــ صغریٰ بیس بائیس برس کی ہوگی۔ اس سے کچھ فاصلے پر انوری ایک مونڈھے پر بیٹھی خالد کی پتلون سی رہی ہے، انوری اپنی بہن صغریٰ سے پانچ چھ سال بڑی ہوگی مغربی دروازے کے پاس رشیدہ کمرے کی واحد کرسی میں دھنسی کاپی پر پنسل سے کچھ لکھ رہی ہے۔ رشیدہ شاید صغریٰ سے ایک دو سال بڑی ہے۔ بانو شلوار اور فراک پہنے ہوئے ہے ـــــ خالد نے نکر کے اوپر قمیص پہن رکھی ہے ـــــ صغریٰ، انوری، رشیدہ کا عام پنجابی لباس ہے یعنی قمیص، شلوار اور دوپٹہ۔

مشرقی دروازہ ملحقہ کمرے میں کھلتا ہے اور مغربی دروازے کے آگے گلی ہے۔

وقت دن کے ساڑھے تین۔)

رشیدہ (انوری کی طرف دیکھ کر): اور کیا لکھوں بھابی؟

خالد (گیند ہاتھ میں لے کر رشیدہ کی طرف منہ کر کے): میرا فٹ بال۔

رشیدہ: لکھ لیا ہے بابا تمہارا فٹ بال بھی

خالد: کتنے روپے لگائے ہیں پھوپھو؟

رشیدہ: روپے؟ ـــ (مذاقاً) روپے کیوں آنے کہو ـــــ بارہ آنے چھ پائی!

خالد: بارہ آنے ـــــ اور سنو، بارہ آنے کی تو ایسی گیند آتی ہے، فٹ بال کہاں آتا ہے؟

رشیدہ: تو کیا لکھوں بھائی؟

خالد: کم از کم پانچ روپے۔

رشیدہ: (لکھتی ہے) کم از کم پانچ روپے ـــــ بھئی زیادہ ہے یہ رقم۔ کچھ اور لے لو مثلاً بسکٹ کا ڈبہ!

خالد: اوں اوں۔ (منہ بنا کر) ابا جان نے کہا نہیں تھا اگلے ہفتے تمہیں فٹ بال لے دیں گے۔ کیوں امی! (ماں کی طرف دیکھتا ہے) کہا تھا ناں؟

انوری: کب کہا تھا؟

خالد: جب ـــــ کہا نہیں تھا صابن مل کر نہا لو تمہیں فٹ بال لے دیں گے۔

صغریٰ: ہائے پانی سے تو ڈر لگتا ہے اسے (رشیدہ کی طرف دیکھ کر) ضرور کہا ہوگا بھائی جان نے! بغیر کسی لالچ کے خالد صابن مل کر نہا لے ـــــ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

انوری: اب کے کمرے کے لئے ایک آرام کرسی اور ایک عام کرسی آئے گی فٹ بال اگلے مہینے سہی!

خالد: میں فٹ بال لوں گا۔ پہلے وعدہ کرتے ہیں پھر مکر جاتے ہیں، بڑے آئے چالاک بن کر۔

(سب ہنس پڑتے ہیں)

انوری: رشیدہ بھئی لکھ لو۔

بانو: اور میں کہاں گئی؟

رشیدہ: آپ گئی کہاں ہیں چارپائی پر بیٹھی ہیں بڑے آرام سے۔

بانو: بھیا کو فٹ بال ملے گا تو میں چوڑیاں لوں گی۔ اس دن والی جو شیشوں کی دکان

پھر دیکھی تھیں (ماں سے مخاطب ہو کر) میں نا امی!

انوری: بھئی مجھے ہر معاملے میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ اپنی پھپھی سے کہو۔ خزانہ انہی کے پاس آئے گا ــــ وزیر خزانہ وہی ہیں۔

بانو: ہائے کتنی پیاری چوڑیاں ہیں۔

رشیدہ: اچھا بانو! مہربانی کر کے ان پیاری چوڑیوں کی قیمت بتا دو۔

بانو: قیمت؟ ــــ خالہ کیا قیمت تھی ان چوڑیوں کی؟

صغریٰ: مجھے تو قیمت ویمت یاد نہیں رہی۔ چھٹیا پا! دو روپے لکھ لو۔

بانو: بھجان کو پانچ روپے کا فٹ بال اور مجھے صرف دو روپے کی چوڑیاں، میں نہیں لوں گی، اپنے پاس ہی رکھو۔

رشیدہ: ہائے اللہ، خود ہی تو کہا ہے میں چوڑیاں لوں گی ــــ اچھا میں تمہیں رنگوں کی ڈبیا بھی لے دوں گی۔

بانو (تالیاں بجاتی ہوئی): بس بس!

انوری: کیا کر رہی ہو رشیدہ؟

رشیدہ: بھابی ان کا مطالبہ چپکے سے مان لیا کرو ــــ مطالبہ بھائی جان تک پہنچا تو اس میں کچھ اور بھی شامل ہو جائے گا۔ یاد ہے پچھلی مرتبہ بانو کو چینی کی گڑیا بھی لے دی اور اس کے ساتھ ایک درجن رنگین پنسلیں بھی۔

انوری: ان کا کیا ہے ــــ (مسکرا کر) اِدھر ذرا آنسو بہائے اُدھر مطالبہ منظور۔!

رشیدہ : اسی لئے تو میں کہتی ہوں ——

صغریٰ : چھٹیا پا! کہہ تو سچ رہی ہو —— مگر سوچ لو یہ شیطان سن رہے ہیں تمہاری بات! وقت پر فائدہ اٹھائیں گے۔

رشیدہ : نہیں یہ تو بڑے اچھے —— بڑے پیارے بچے ہیں —— کیوں خالد۔

خالد : ہم بڑے اچھے ہیں —— فٹ بال نہیں ملے گا تو ابا جان سے رو کر کہہ دوں گا۔ ہاں۔

صغریٰ : سن لیا چھٹیا پا اور کہو ان کے سامنے۔

رشیدہ : میں نے دونوں چیزیں لکھ لی ہیں۔ (کاپی پر نگاہیں جما کر) خالد میاں کا فٹ بال اور بانو کے لئے خوبصورت چوڑیاں اور رنگوں کا ڈبہ۔

انوری : بیس روپے بنک میں جمع کرانا ہیں۔

رشیدہ : اوہ —— یہ بات یاد ہی نہیں رہی —— لکھتی ہوں —— (لکھتی ہے) بیس روپے کی رقم بنک کے لئے بچوں کی تعلیمی مد میں۔

صغریٰ : پکچر کا خرچ لکھا چھٹیا پا!

خالد : اخاجی مزا آگیا۔ دو پکچریں —— ایک انگریزی ایک اُردو۔ (خوشی سے ناچتا ہے)

انوری : دو نہیں بھائی —— اب کے ایک —— اور خرچ بھی تو ہیں۔

خالد : نہیں دو۔

انوری : پکنک بھول گئے ہو؟

رشیدہ : ایک پلنگ اور ایک پکچر، یہ ٹھیک ہے ـــــ اچھا بھابی! تمہارے لئے کیا لکھوں؟

انوری : سلیپر لکھ لو، گھر میں پہننے کے لئے۔

رشیدہ : کوئی پوڈر، کوئی سرخی نہیں؟

انوری : اپنے بھائی جان کے لئے کیا لکھا ہے؟ ان کے بوٹ پرانے ہوگئے ہیں ایک نئی بوشرٹ بھی بنے گی، سگرٹ کے دو ٹن۔

رشیدہ : سگرٹ پینا انہوں نے چھوڑ دیا ہے اس لئے یہ آٹھ روپے تمہارے لئے ہیں۔ بھائی جان کہہ گئے تھے صبح۔

انوری : دیکھا جائے گا ـــــ اپنے لئے کچھ لکھ لو، ہاں اب کے تمہیں فونٹن پن ضرور لے کر دینا ہے۔ بڑا پرانا وعدہ ہے۔

خالد : پھپھو خوش ہو گئی ہیں فونٹن پن لکھ کر۔

انوری (مسکرا کر) : چپ بدتمیز۔

صغریٰ : ایک اور بات سنو چھٹیاپا! اسی مہینے آپا حسناں کے بڑے لڑکے کی شادی ہے، ہم سب کو جانا ہوگا۔

انوری : اس شادی کے لئے بیس روپے میں نے پچھلے مہینے بچائے تھے۔

صغریٰ : آپا تو بڑی دور اندیش ہیں۔

انوری : چلو یہ کام بھی ختم ہوا۔

رشیدہ : اب صرف یہ فرض باقی رہ گیا ہے کہ بھائی جان آئیں تو چائے کی پیالی کے ساتھ یہ بجٹ بھی ان کی خدمت میں پیش کر دیا جائے اور جب دستخط کر دیں تو بازار جا کر چیزیں خرید لی جائیں۔

انوری : ذرا بتا تو دو لکھا کیا ہے؟

رشیدہ : سُن لو —— بیس روپے مکان کا کرایہ، پانچ روپے بجلی کا بل، سولہ روپے راشن کے لئے، دس روپے دال، مرچ اور مسالے کے لئے، پینتیس روپے کرسیوں کے لئے، دس روپے بچوں کے لئے اور بیس روپے کی قسط بنک میں بھیجنی ہے، بچوں کے لیے تعلیمی مد میں —— متفرق خرچ چالیس روپے، اور ہاں! بھائی جان کے لئے بیس روپے۔

انوری : تیس روپے لکھو۔ بش شرٹ بھی آئے گی اور چپل بھی۔

رشیدہ : اُن کے علاوہ فونٹن پن —— نہیں بھابی! یہ نہیں آئے گا اب کے، اگلے مہینے سہی، چائے کا بنڈل بھی آئے گا اور ٹی سٹ کی دو پیالیاں ٹوٹ گئی ہیں وہ بھی خریدی جائیں گی۔

صغریٰ : متفرق خرچ میں بیس روپے اور جمع کر دو چھٹیا پا! پکچر وغیرہ کے لئے۔

انوری : اب کے نیا کپڑا تو نہیں سلوایا جائے گا۔

رشیدہ : بھائی جان کے لئے پجامے کا کپڑا آئے گا اور تو کچھ نہیں۔

انوری : بس بھئی اب حساب بند کر دو۔

رشیدہ: رقم جمع تو کر لوں بھابی!

(رشیدہ سر جھکا کر کاپی پر لکھنے لگتی ہے ـــــ مشرقی دروازے سے اماں آتی ہے۔ نحیف و نزار بڑھیا، سر کے بال سفید، چہرہ جھریوں میں پٹا ہوا، آنکھوں پر عینک، دائیں ہاتھ میں لاٹھی، آہستہ آہستہ قدم اٹھائے آتی ہے)

انوری: اماں جان آگئیں!

اماں (مسکرا کر): کیا ہو رہا ہے یہاں ـــــ ارشد آگیا ہے؟

انوری (کلاک کی طرف دیکھ کر): ابھی کچھ منٹ باقی ہیں۔ پورے چار بجے آئیں گے۔

(رشیدہ جلدی سے کرسی اٹھا کر اماں کے قریب لاتی ہے)

رشیدہ: بیٹھ جائیے اماں جان!

اماں: تم بیٹھی رہو نا ـــــ میں ذرا آئی تھی یہ دیکھنے کے لئے کہ ارشد آگیا ہے یا نہیں۔ آج تنخواہ کا دن ہے، ذرا دیر سے ہی آئے گا (رشیدہ سے مخاطب ہو کر اور مسکرا کر) تم کیا کر رہی ہو بیٹی؟

رشیدہ: بجٹ بنا رہی ہوں۔

اماں: کیا بنا رہی ہو؟

(خالد جلدی سے آتا ہے)

خالد: میں بتاؤں نانو (اماں کے کان سے منہ لگا کر) گُر رگُر ر ر ر ر ـــــ گُر!

اماں (مسکرا کر): شیطان کہیں کا۔

رشیدہ: حساب کتاب لکھ رہی ہوں اماں جان!۔

اماں: اچھا شوق سے لکھو۔ اللہ میرے کمانے والے کو سلامت رکھے۔

انوری: بیٹھ جائیے نا اماں جان!

اماں: نہیں بیٹی! اُدھر جاؤں گی باورچی خانے میں۔

صغریٰ: ہائے کھیر کی پلیٹیں باورچی خانے میں پڑی ہیں بلی آ کر کھا لے تو۔

خالد: میں چلا جاؤں خالہ؟

صغریٰ: جی ہاں —— تم تو خوب حفاظت کرو گے۔

رشیدہ: بلی نہ جائے دو ٹانگوں والا بلا چلا جائے —— کیا فرق پڑتا ہے!

اماں: میں جاتی ہوں۔ ابھی دروازہ بھیڑ آئی تھی۔

صغریٰ: چھٹیا پا! اماں کی عینک ٹوٹ گئی ہے۔

اماں: گذارہ ہو رہا ہے بیٹی —— میری فکر نہ کرو —— اپنی چیزیں لکھو صغریٰ!

رشیدہ: نیا فریم خرید لیں گے، شیشے تو ٹھیک ہیں۔

اماں: صغریٰ! تو کیا کر رہی ہے؟

صغریٰ: کچھ نہیں اماں۔

اماں: استری کر رہی ہو —— اللہ ماری یہ بجلی کی استری کیسے گھر میں آ گئی ہے۔

(ذرا غصے سے) دھوبن کو کپڑے کیوں نہیں دیتیں؟

رشیدہ: اماں کو تو بجلی کی استری سے نفرت ہے، نام ہی نہیں سن سکتیں اس کا۔

اماں : نفرت نہیں، ڈر آتا ہے بجلی سے —— ایک بار تو مجھے بھی شاٹ لگا تھا،

توبہ —— (دائیں کہنی سہلاتی ہے)

رشیدہ : آخر بھائی جان بھی تو بجلی گھر میں کام کرتے ہیں۔

اماں (لہجے میں فکر کی آمیزش) : کئی بار کہہ چکی ہوں اس سے، بچہ یہ کام چھوڑ کر کوئی اور

ملازمت کر لے، پر مانتا ہی نہیں۔ روز دعا کرتی ہوں (کرتے کا دامن اٹھا کر)

پاک پروردگار! میرے ارشد کو ہر آفت سے بچا —— ہر روز خیر خیریت سے

گھر واپس آئے، اپنے بیوی بچوں میں۔ آمین!

(دو تین لمحوں کے لئے سب خاموش ہو جاتے ہیں —— یکایک کلاک چار بجاتا ہے ——

سب کے چہروں پر پھر مسرت کی شادابی چھا جاتی ہے اور وہ مسرور نظروں سے مغربی

دروازے کی طرف دیکھنے لگتے ہیں —— اماں چل کر دروازے کے قریب پہنچ جاتی

ہے —— دونوں بچے دروازے پر جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں)

انوری : دیکھو خالد! انہیں پریشان نہ کرنا۔ تھکے ہوتے ہیں، تم فرمائشیں شروع کر

دیتے ہو —— ذرا آرام بھی نہیں کرنے دیتے ان کو۔

خالد : اچھا!

(دونوں بچے دروازے سے باہر بھاگنے لگتے ہیں)

انوری : خالد! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ یہیں ٹھہرو!

خالد (دروازے پر واپس آ کر) : امی! ابا کی مدد نہ کروں؟ بوجھ اٹھایا ہوگا انہوں نے۔

(سب ہنس پڑتے ہیں —— بانو واپس آجاتی ہے)

صغریٰ: توبہ کتنا ہمدرد ہے باپ کا۔

انوری: بالکل نہیں جانا باہر۔

(خالد تیزی سے چلا جاتا ہے۔ بانو وہیں کھڑی رہتی ہے۔ اماں بھی دروازے پر پہنچ کر بیتابی سے باہر دیکھنے لگتی ہے ——)

صغریٰ: چھٹیا پا! ساری رقم جمع کرلی ہے نا؟

رشیدہ: ہاں!

انوری: پھر چائے لے آؤ اپنے بھائی جان کے لئے۔

(رشیدہ اٹھ کر مشرقی دروازے میں جاتی ہے اور دو تین لمحوں میں تپائی اٹھائے آتی ہے۔ تپائی کرسی کے آگے رکھ دیتی ہے، پھر کرسی سے کاپی اٹھا کر تپائی کے ایک کونے پر رکھنے کے بعد دوبارہ مشرقی دروازے کی طرف جانے لگتی ہے —— خالد آتا ہے —— چہرے کا رنگ زرد، سہما ہوا، رک رک کے قدم اٹھاتا ہوا —— بانو حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے)

صغریٰ: کیا ہوا خالد؟

(صغریٰ جلدی سے خالد کی طرف جاتی ہے۔ رشیدہ دروازے سے واپس آجاتی ہے —— انوری بھی اٹھ کر خالد کی طرف جاتی ہے)

انوری اور رشیدہ (ایک ساتھ): کیا ہوا خالد؟

(خالد کوئی جواب نہیں دیتا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کو دیکھ رہا ہے)

انوری: خالد بیٹا! وہ کہاں ہیں ——؟!

(خالد رونے لگتا ہے)

اماں: میرے اللہ —— میرا ارشد صحیح سلامت ہو —— میرے پاک پروردگار!

صغریٰ: خالد! بات کیا ہے —— (اس کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتی ہے) خالد!

(خالد دروازے کی طرف اس انداز سے دیکھنے لگتا ہے جیسے کسی کے آنے کا منتظر ہو، پھر زار و قطار رونے لگتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا منظر

(پہلے منظر اور اس منظر میں کئی دن کا فاصلہ ہے —— وہی کمرہ جو پہلے منظر میں دکھایا گیا ہے، سامنے دیوار پر کلاک بدستور ٹک ٹک کر رہا ہے، چار بجنے میں بیس یا تیس منٹ باقی ہیں —— گھر کی فضا ایک گہرے غم میں ڈوبی ہوئی ہے —— بانو چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہے، قلم منہ میں ہے اور خالد کو گھور گھور کر دیکھ رہی ہے، آنکھوں کے نیچے کتاب کھلی پڑی ہے، چارپائی کے دوسرے سرے پر خالد بیٹھا ہے —— کسی فکر میں گم سم —— چارپائی سے کچھ دور زمین پر خالد کی ربڑ کی گیند پڑی ہے ——

مشرقی دروازے کے پاس تپائی کے اوپر بجلی کی استری نظر آ رہی ہے ——

صغریٰ ایک پیڑھی پر بیٹھی ہے، بائیں ہاتھ میں دال کی تھالی پکڑ رکھی ہے اور داہنے ہاتھ سے اسے صاف کر رہی ہے، انوری مونڈھے پر بیٹھی کسی پھٹے پرانے کپڑے میں ٹانکا لگا رہی ہے —— مغربی دروازے کے پاس رشیدہ ایک چوکی پر بیٹھی ہے، ہاتھ میں پنسل اور کاپی ہے)

رشیدہ (لہجہ افسردہ): اور کیا لکھوں بھابی؟

انوری (آہ بھر کر): میں کیا بتاؤں؟

صغریٰ (بیٹھی ہوئی آواز): چھٹیا پا! لکھا گیا ہے؟

رشیدہ: صرف ضروری اخراجات، جن کے بغیر گزارہ ہو ہی نہیں سکتا۔ سنا دوں؟

صغریٰ: فیس لکھی ہے بچوں کی؟

رشیدہ: سن لو —— صرف وہی اخراجات لکھے ہیں جو کسی طرح کم ہو ہی نہیں سکتے۔ مکان کا کرایہ بیس روپے، بجلی کا خرچ پانچ روپے۔

صغریٰ: چھٹیا پا! رات کے وقت لالٹین جلا لیا کریں گے —— مٹی کے تیل پہ ڈیڑھ روپے سے زیادہ خرچ نہیں آئے گا۔

رشیدہ: بچوں کی آنکھوں پر مٹی کے تیل کا دھواں برا اثر کرے گا —— یہ خرچ رہنے دو۔!

صغریٰ: کم از کم باورچی خانے میں تو لالٹین جلے گی —— مجھے بجلی کی روشنی اچھی نہیں لگتی۔!

(انوری بہن کی طرف اس انداز سے دیکھتی ہے جیسے کہہ رہی ہو ـــ تو جھوٹ بول رہی ہے)

صغریٰ: سچ کہتی ہوں آپا!

رشیدہ: آگے سنو! آٹھ روپے فیس۔

انوری: فیس معاف نہیں ہوگی ـــ اب تو یتیم بچے ہیں۔ (آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

رشیدہ: اور خرچ تو ضروری ہے ـــ کاپیاں، کتابیں، پنسلیں، قلم وغیرہ، یہ چیزیں تو بہرحال آئیں گی، آٹھ روپے لکھ لیتی ہوں۔

صغریٰ: جیب خرچ دو روپے ـــ آخر بچے ہیں۔

رشیدہ: ٹھیک ہے۔

صغریٰ: چھوٹی آپا! بچوں کے سب اخراجات میں اپنے ذمے لیتی ہوں ـــ بچی بختاور نے اپنے گھر میں ایک پرائمری سکول کھول رکھا ہے ـــ وہاں جایا کروں گی۔

رشیدہ: منیر کے ابا کہتے ہیں، بجلی گھر کے بڑے صاحب بچوں کے لئے کچھ رقم کمپنی کی طرف سے منظور کروا دیں گے۔

انوری (آہ بھر کر): کچھ نہیں ہوگا میری بہن! کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کسی سرکاری دفتر میں کوئی بڑے افسر نہیں تھے، معمولی کاریگر تھے، کون پروا کرتا ہے معمولی کاریگروں اور چھوٹے ملازموں کی، سلمیٰ کے ابا بھی تو اسی قسم کے حادثے میں مرے تھے۔ کتنی کوشش کی تھی گھر والوں نے ـــ مگر سوکھی ہمدردیوں کے سوا دفتر کے بڑے افسر نے کچھ بھی نہیں دیا تھا۔ (انوری دوپٹے سے آنسو پونچھتی ہے)

رشیدہ : بھابی! سنا ہے کپڑا سینے کی مشین کرائے پر مل جاتی ہے۔

انوری : خبر نہیں!

رشیدہ : ڈپٹی صاحب کی کوٹھی میں ہمارا آنا جانا تو ہے ہی کافی کام مل جائے گا وہاں سے۔

صغریٰ : میں یہ (بجلی کی استری کی طرف اشارہ کرکے) استری بیچ دوں گی، کیا ضرورت ہے اس کی۔

رشیدہ : ہمیں کن چیزوں کی ضرورت نہیں ہے؟

صغریٰ : یہ کلاک نہیں چاہیے۔

انوری : کلاک ــــ؟ (رونے لگتی ہے) نہیں یہ نہیں۔

(ماں کو دیکھ کر بچے بھی رونے لگتے ہیں)

رشیدہ : بھابی!

صغریٰ (جلدی سے آنسو پونچھ کر) : آپا! بچوں کا خیال کرو۔ (بچوں کی طرف دیکھ کر) خالد! بانو! جاؤ باہر جا کر کھیلو ــــ جاؤ بچو!

(بچے وہیں کھڑے رہتے ہیں)

رشیدہ : کرسی کی بھی ضرورت نہیں۔ بھائی جان نے مجھے کپڑے بنوا دئے تھے، میں نے تو کبھی پہنے ہی نہیں۔ شوق ہی نہیں اور پھر وہ ساری بھی بے کار پڑی ہے جو خالہ خورشید نے حامدہ کی شادی پر دی تھی۔

انوری : کیوں میرا کلیجہ چھلنی چھلنی کر رہی ہو! —— یہ چیزیں تمہاری ہیں۔ تمہیں اللہ مبارک کرے۔

رشیدہ : بھابی! —— سچ کہتی ہوں مجھے ان چیزوں کی بالکل ضرورت نہیں۔

انوری : سر پر دو سو تیس قرض بھی ہے۔ میرے پاس جتنے روپے جمع تھے وہ تو اسی دن خرچ ہو گئے تھے جس دن میرا گھر تباہ ہوا تھا۔ (سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتی ہے)

رشیدہ : ہاں بھابی!

انوری : بنک میں کتنا روپیہ جمع ہو گا؟

رشیدہ : وہ تو بچوں کی تعلیم کے لئے ہے۔

انوری (لمبی آہ بھر کر) : بچوں کی تعلیم —— میرا خالد ایم۔ اے کیونکر کر سکے گا۔ میری بانو لیڈی ڈاکٹر کس طرح بنے گی۔ میرا خواب ختم ہو گیا —— ختم ہو گیا (آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں)

رشیدہ! قرض ادا ہو جائے گا اس رقم سے؟

رشیدہ : ہاں بھابی!

انوری : صغریٰ! ایک دفعہ منیر کی ماں نے کہا تھا۔ صفیہ کو قرآن مجید پڑھا دیا کرو۔ میں صرف صفیہ ہی کو نہیں، محلے کے سب بچوں کو پڑھا دیا کروں گی!

رشیدہ : بھابی! تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں!

انوری: مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تو اور کون کرے گا۔ یہ ساری عمر کا بوجھ کون اٹھائے گا۔ تم کب تک یہاں بیٹھی رہو گی —— اپنے اپنے گھر چلی جاؤ گی —— ساری عمر کا بوجھ کون اٹھاتا ہے۔

رشیدہ: بھابی! کچھ مدت کی بات ہے۔ خالد بڑا ہو جائے گا۔

(جیسے تاریک فضا میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی ہے —— سب کی نظریں خالد پر پڑتی ہیں جو چپ چاپ بیٹھا اپنی گیند دیکھ رہا ہے)

انوری: خالد! —— میرا خالد!!

(مشرقی دروازے سے اماں آتی ہے، کمر خمیدہ، عینک کی ایک کمانی کی بجائے دھاگا بندھا ہوا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہے —— اور چپ چاپ ایک جگہ کھڑی ہو جاتی ہے —— کلاک چار بجے کا اعلان کرتا ہے —— یک لخت سب کی نظریں دروازے پر اٹھتی ہیں۔ اماں دروازے پر جا کر انتہائی مایوسی سے اپنا سر دروازے پر لگا دیتی ہے۔)

(پردہ گرتا ہے)

نہ نہ نہ

افرادِ تمثیل

چپڑاسی

باپ

بیٹا

جونیئر کلرک

سینئر کلرک

سپرنٹنڈنٹ

چھوٹا ڈاکٹر

بڑا ڈاکٹر

کسی پاگل خانے میں ملاقات کا کمرہ

یہ کمرہ اعلےٰ درجے کے فرنیچر سے مزین ہے۔ سامنے کی دیوار پر قائد اعظم کی بڑی تصویر آویزاں ہے جس کے نیچے جلی حروف میں لکھا ہے:

"محبت، دیانت داری اور خلوص سے لوگوں کی خدمت کرو۔"

کمرے کے وسط میں ایک نئے ڈیزائن کا صوفہ سیٹ پڑا ہے۔ صوفہ سٹ سے کچھ دور ہٹ کر ایک خاص ترتیب کے ساتھ چار کرسیاں رکھی گئی ہیں۔ کرسیوں کے علاوہ ایک خوبصورت چھوٹی سی میز بھی پڑی ہے۔ آنے جانے کے لئے صرف ایک دروازہ ہے جو مغربی دیوار میں ہے اور جس پر نیلے رنگ کا پردہ لٹک رہا ہے۔

سٹیج کا پردہ اٹھنے کے بعد تین چار لمحوں تک سٹیج خالی رہتی ہے۔ پھر چپڑاسی اندر آتا ہے اور دروازے کے پاس اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے جیسے کسی آنے والے کے انتظار کر رہا ہو۔

دو تین لمحوں کے بعد باپ آتا ہے اور اس کے پیچھے بیٹا۔

باپ نیلے رنگ کے تہمد اور گاڑھے کے کُرتے میں ملبوس ہے۔ سر پر پگڑی، جسم نحیف و نزار، بازو صرف ایک سلامت، بایاں بازو غائب، داڑھی چھوٹی اور کھچڑی۔ چہرے سے تو عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تاہم چالیس اور پچاس کے درمیان ہوگی۔

بیٹا سفید تہمد، سفید کُرتا اور کرتے کے اوپر واسکٹ پہنے ہوئے ہے۔ عمر اندازاً پندرہ برس ہوگی۔ چہرے پر بیزاری کے اثرات نمایاں ہیں۔

چپڑاسی انہیں دیکھ کر صوفے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ باپ کمرے کی چھت اور دیواروں پر نظر ڈالتا ہوا صوفے کی طرف جاتا ہے۔ اپنے اکلوتے ہاتھ سے صوفے کی سیٹ کو چھوتا ہے اور پھر اس پر بیٹھ جاتا ہے۔ چپڑاسی اسے دیکھ کر مسکراتا ہے۔ پھر وہ بیٹے کو دیکھتا ہے جو بیزاری اور بے نیازی کے عالم میں باپ کے پاس کھڑا ہے باپ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بیٹا نفی میں سر ہلاتا ہے)

باپ: شبرے پتر! بیٹھ بھی جاناں!

بیٹا: نہ نہ نہ۔

چپڑاسی: نہ نہ نہ کیا ہوا؟

باپ: ہر بات پر نہ نہ ہی کہتا ہے اور کوئی بات نہیں کرتا۔ یا 'اماں' کہتا ہے۔

چپڑاسی: اچھا ——— (بیٹے سے) بیٹھ بھی یار ——— چھوٹے چودھری!

باپ (چپڑاسی کے اندازِ تخاطب سے خوش ہو کر): دیکھ پتر! کہا مان لے ناں۔ کتنے پیار سے کہتے ہیں بیٹھ چھوٹے چودھری۔

چپڑاسی: اصلی چودھری یہ ہے ہمارے لئے۔ ہاں۔ اچھا بیماری کیا ہے اسے؟

باپ (آہ بھر کر): کیا بتاؤں بھائی! بھلا چنگا تھا جیسے دوسرے لڑکے ہوتے ہیں۔ کھاتا تھا، کھیلتا تھا، ہنستا بولتا تھا۔ میں لڑائی میں چلا گیا تو یہ اداس اداس رہنے لگا۔

چپڑاسی: تمہاری جدائی میں۔

باپ: اللہ نے صرف یہی اولاد دی ہے۔ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے۔ میں باہر چلا جاؤں تو اداس ہو جاتا ہے۔

چپڑاسی: تو ایسی حالت کیسے ہو گئی؟

باپ: میں لڑائی میں تھا اور گھر آنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا کہ گولی (بائیں بازو کی طرف اشارہ کر کے) یہاں لگی۔ ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر نے بازو کاٹ دیا اور مجھے فوج سے جواب مل گیا۔ گھر پہنچا تو شیرا بہت خوش ہوا۔ پر میرے بازو کے کٹ جانے کا اسے بڑا دکھ ہوا اور پھر گھر میں ایک اور مصیبت بھی آ گئی۔

چپڑاسی: ہوں۔

باپ: میں بیکار تھا، تنگی رہنے لگی۔ ساری پونجی لگا کر دوکان کھولی تو اس میں گھاٹا پڑنے لگا۔ اس کی ماں مجھ سے لڑتی رہتی تھی اور شیرا ہماری لڑائی سے بڑا گھبراتا تھا۔ ہمیں لڑتے دیکھ کر رو پڑتا تھا اور گھر سے نکل جاتا تھا۔ اسی زمانے سے اس کی حالت خراب ہونے لگی۔ پہلے پہل زیادہ چپ نہیں رہتا تھا۔ پھر اس کے

بعد حالت خراب ہوتی گئی۔

چپڑاسی : تو پیسے ویسے کہاں سے آتے ہیں چودھری ؟

باپ : گذارہ ہو جاتا ہے۔ روکھی سوکھی کھا کر پیٹ بھر لیتے ہیں۔

چپڑاسی : دوکان ہے نا ؟

باپ : ہے ـــــ میاں ! یہی تو روٹی دیتی ہے، بارہ چودہ آنے روز بن جاتے ہیں۔

چپڑاسی : پھر کیا ہوا ؟

باپ : پہلے پہلے تو ہم سے چھپ کر رویا کرتا تھا اور بہت کم بولتا تھا، پھر یہ حالت ہو گئی کہ نہ کھانے کی سدھ رہی نہ پینے کا دھیان۔ میں نے یا اس کی ماں نے زبردستی روٹی کھلا دی تو کھالی، نہیں کھلائی تو بھوکا ہی پڑا رہا۔ نہ کسی سے بولتا چالتا ہے نہ کوئی کام کاج کرتا ہے۔ ہماری تو زندگی برباد کر دی ہے اس پُتر نے۔ اللہ جانے دماغ میں کیا خرابی ہو گئی ہے ؟

چپڑاسی : آلاج کروایا ہے ؟

باپ : بڑا جی۔ کئی حکیموں نے دیکھا ہے، تویذ تاگے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

چپڑاسی : فکر کیوں کرتے ہو چودھری۔ ٹھیک ہو جائے گا۔

باپ (آہ بھر کر) : ہو جائے تو پھر کیا چاہیے۔

چپڑاسی : تو ـــ دیکھو چودھری ! ذرا رازدارانہ انداز میں، کچھ دینا دلانا پڑے گا۔

باپ : میں کنگال کیا دوں گا بھلا ؟

چپڑاسی : کچھ لائے ہو ساتھ اپنے ؟

باپ : اس کی ماں نے بڑی مصیبتوں سے ڈیڑھ سو روپیہ بچایا ہے۔ ایک ایک پیسہ جوڑ کر۔ میں نے کہا پگلی! یہ روپیہ مجھے دے دے، ہمارے شبیر پر خرچ ہوگا۔ ہمارا شبیر الٹھیک ہو گیا تو ہزاروں روپے کما لے گا۔ گھر میں چہل پہل ہو جائے گی اس نے دے دئے روپے۔

چپڑاسی : چودھری مجھے لگتا ہے تمہارا بیٹا بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں سے تو ایسے ایسے لوگ ٹھیک ہو کر گئے ہیں جنہیں ان کے رشتہ دار زنجیروں میں باندھ کر لائے تھے۔ تمہارا لڑکا (لڑکے کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے) تو ان کے مقابلے میں کچھ ہے ہی نہیں۔ یہاں بجلی سے آلاج ہوگا —— تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔

باپ : اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔

چپڑاسی : یہاں پاگلوں کو بڑی ہی مشکل سے داخل کرایا جاتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو سفارشیں ہوتی ہیں اور لوگ بڑا خرچ کرتے ہیں پھر کہیں جا کر کسی کو داخل کیا جاتا ہے۔

باپ : اچھا جی!

چپڑاسی : ہزاروں روپے خرچ ہوتے ہیں ہزاروں۔

باپ : پر میں تو ——

چپڑاسی: او چودھری گھبرا کیوں گیا ہے۔ ہم مر گئے ہیں جو تیرے بیٹے کا داخلہ نہیں ہو گا۔ دیکھنا ذرا منشی جی کی مٹھی گرم کر دیں گے تو سارا کام ہو جائے گا۔

باپ: منشی کون ہے؟

چپڑاسی: جو یہ داخلہ داخلہ کرتا ہے۔

باپ: کتنے روپے لے گا۔ یار میں بڑا ہی غریب آدمی ہوں۔

چپڑاسی: کام تو پچاس ساٹھ کا ہے پر تو پندرہ بیس دے دے۔ منت کر لوں گا تمہاری خاطر۔

(باپ ڈب کھولتا ہے۔ پانچ پانچ کے دو نوٹ نکالتا ہے)

باپ: میری طرف سے ہاتھ جوڑ دینا۔ کہنا بڑا ہی مسکین آدمی ہے۔

چپڑاسی: اچھا!

(چپڑاسی نوٹ لے کر جانے لگتا ہے)

باپ: میں نے کہا جی! کتنے دنوں میں ٹھیک ہو جائے گا شیرا؟

چپڑاسی: بھئی یہ نہیں کہہ سکتا۔ یہ بات ڈاکٹر بتائے گا۔ تمہارا بیٹا ٹھیک بالکل ہو جائے گا اور کیا چاہیئے؟

(چپڑاسی کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ باپ ڈب بند کر کے بیٹے کی طرف آتا ہے)

باپ (بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر): کیوں شیرے پتر کیا حال ہے؟

بیٹا: نہ نہ نہ۔

باپ (بیٹے کی نقل اتارتے ہوئے) : نہ نہ نہ ——— پگلا !

(جونیئر کلرک آتا ہے۔ دونوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ وہ پتلون اور قمیص

پہنے ہوئے ہے۔ تیس سال عمر ہو گی)

جونیئر کلرک : کیا ہو رہا ہے چودھری ؟

باپ : سلام صاب جی ! ——— جی اپنے پتر سے کہہ رہا ہوں اب تو ٹھیک

ہو جائے گا۔

جونیئر کلرک : نہ نہ نہ تو تم بھی کہہ رہے تھے۔

باپ : وہ تو ——— جی ——— ہی ہی ہی ———

جونیئر کلرک : نام کیا ہے اس کا ؟ (بیٹے کے قریب جا کر اور اسے غور سے دیکھ کر)

یہ تو بالکل بھلا چنگا دکھائی دیتا ہے چودھری !

باپ : ویسے بھلا چنگا ہے پر دماغ میں کچھ ہو گیا ہے۔ چیخ چیخ کر مر جاؤ "نہ نہ نہ"

یا "اماں" کے سوا کچھ نہیں کہتا (آہ بھر کر) ہمارا اس کے سوا اور ہے کون ؛

اچھا ہو جائے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے۔

جونیئر کلرک : بیڑا ضرور پار ہو گا۔

باپ : اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔

جونیئر کلرک : اگر یہاں پاگل ٹھیک نہ ہوں تو پھر اس ہسپتال کا کام کیا ہے چودھری !

باپ : وہاں بڑا علاج کرایا پر کچھ نہ ہوا آخر ایک سیانے نے کہا اسے ———

جونیئر کلرک (فقرہ مکمل کرتے ہوئے): پاگل خانے میں لے جاؤ۔

باپ: جی ہاں ——— صاب جی! اس کی ماں اور میں نے بڑا دکھ اٹھایا ہے۔ اللہ کرم کر دے گا تو ہم ساری عمر ہسپتال والوں کو دعائیں دیتے رہیں گے۔

جونیئر کلرک: انشاءاللہ!

باپ: تو داخل ہو گیا ہے شیرا صاب جی۔

جونیئر کلرک: نہیں بھئی۔ ابھی کہاں۔ یہاں تو لوگ ایک ایک مہینہ چکر لگاتے ہیں جب کہیں جا کے ان کا کوئی عزیز داخل ہوتا ہے تم تو ابھی ابھی آئے ہو۔

باپ: میں تو دور سے آیا ہوں اور پھر بڑا ہی غریب ہوں۔

جونیئر کلرک: گھبرا کیوں گئے ہو، کوشش کریں گے کہ آج ہی داخل کر لیا جائے عام پاگلوں میں رکھنا چاہتے ہو یا الگ کمرے میں؟

باپ: جی!

جونیئر کلرک: عام پاگلوں کو تو ایک بڑے کمرے میں رکھا جاتا ہے۔ اگر یہاں داخل کرانا چاہتے ہو تو ابھی کرا دیتا ہوں۔ چپڑاسی نے تمہاری بڑی سفارش کی ہے۔

باپ: صاب جی!

جونیئر کلرک: کہو میاں!

باپ: الگ کمرے میں رکھ لیں تو آپ کی آل اولاد کو ساری عمر دعائیں دیتا رہوں گا۔

جونیئر کلرک : الگ کرے ہیں ـــــ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔

باپ : کھیر ـــــ؟ جی کیسی کھیر؟

جونیئر کلرک : ایک صورت ہو سکتی ہے کہ میں صاحب سے کہہ دوں۔

باپ : تو کہہ دیں ـــــ جی!

جونیئر کلرک : کہہ دوں گا اور کرا بھی دوں گا، پر دیکھو وہاں جو نوکر ہوتے ہیں انہیں تنخواہ پاگل کے عزیزوں سے لے کر دی جاتی ہے۔

باپ : کیا دوں؟

جونیئر کلرک : دے دو ـــــ ہاں ـــــ دس، دس بیس تو ایک نوکر کی تنخواہ ہوئی دس جمعدار کے اور کچھ انعام۔ بس پچیس میں کام بن جائے گا۔

باپ : اچھا جناب!

(ڈبہ کھول کر پانچ پانچ کے چھ نوٹ ـــــ اور پھر ایک اور نوٹ نکالتا ہے اور جونیئر کلرک کو دیتا ہے)

ٹھیک ہے جی؟

جونیئر کلرک : ٹھیک ہے، ابھی دیتا ہوں جا کر ـــــ اور دیکھو میاں! کسی کو بتانا نہیں اور لوگ بھی یہی کرے چاہتے ہیں ـــــ کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔

باپ : اچھا جی!

(جونیئر کلرک آگے بڑھ کر بیٹے کی ٹھوڑی انگلی سے چھوتا ہے)

جونئر کلرک: ٹھہر جا بیٹا! اب تجھ سے باتیں ہوں گی!

(باپ ہنستا ہے۔ جونئر کلرک دروازے کا پردہ ہٹا کر کمرے سے نکل جاتا ہے

باپ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے ــــ بیٹا اٹھ بیٹھتا ہے ــــ باپ

اس کی طرف تیزی سے جاتا ہے)

باپ: پتر!ــــ میرا بیبا پتر!!

بیٹا: نہ نہ نہ۔

باپ: اب تو تیرا علاج ہو رہا ہے شیرے!

بیٹا: اماں۔

باپ: اماں کے پاس چلیں گے۔ ذرا ٹھہر جا ناں۔ ضرور چلیں گے۔ گھر نہیں جائیں گے

تو اور کہاں جائیں گے؟

(سینئر کلرک آتا ہے پتلون اور نیلے رنگ کی بوشرٹ پہنے ہوئے ہے ــــ

باپ کو غور سے دیکھتا ہے ــــ)

سینئر کلرک: اے دیکھو ــــ بڑے میاں کہاں گئے؟

باپ: بڑے میاں! کون جی؟

سینئر کلرک (ایک صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے): یہاں جو صاحب بیٹھے تھے،

سفید داڑھی والے۔ ساتھ ان کے ایک لڑکا بھی تھا۔

باپ: میں نے دیکھا نہیں جی!

سینئر کلرک: حد ہو گئی ہے بھئی پاگل پن کی۔ لوگ یہاں سے جاتے ہیں تو کہتے ہیں پاگل خانے والے اچھا سلوک نہیں کرتے حالانکہ قصور ان کا اپنا ہوتا ہے۔

باپ: ضرور ہوتا ہے۔

سینئر کلرک: اب یہی دیکھو یہ بڑے میاں تین ماہ سے یہاں کا چکر لگا رہے تھے۔ بیٹے کا دماغ ذرا خراب ہو گیا ہے۔ آدمی رئیس ہیں چاہتے ہیں ان کے بیٹے کو اعلیٰ درجے کا کمرہ ملے۔ آج وہ کمرہ خالی ہوا ہے تو حضور غائب ہو گئے ہیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ کمرہ رُک جائے گا اور کیا ہوگا۔ ایسے کمرے ایک منٹ بھی خالی نہیں رہتے۔

باپ: یہاں آلا درجے کے کمرے بھی ہیں صاب جی؟

سینئر کلرک: یہ جو کمرہ خالی ہوا ہے بہت ہی اچھا ہے۔ ایک نہیں دو کمرے ہیں۔ ایک میں تو مریض رہتا ہے اور دوسرے میں اس کا کوئی عزیز وغیرہ۔

باپ: پاگل کا باپ بھی رہ سکتا ہے؟

سینئر کلرک: یہی بات میں کہہ رہا ہوں مولوی صاحب!

باپ: اب ان میں کون جائے گا؟

سینئر کلرک: کون جائے گا؟ یہ کیوں پوچھتے ہو، جو بھی اس کا حقدار ہوگا چلا جائے گا۔

باپ: میرا مطلب ہے صاب جی رئیس آدمیوں کے بیٹے ہی ان کمروں میں رہتے ہیں؟

سینئر کلرک: بالکل نہیں۔ یہ سرکاری ہسپتال ہے یہاں غریبوں اور امیروں سے

ایک جیسا سلوک ہوتا ہے۔ کہو کیا بات ہے؟

باپ: میں نے بھی اپنے شیرے کو داخل کرا دیا ہے۔

سینئر کلرک: داخل ہوا تو نہیں —— ہو ضرور جائے گا مگر معمولی کمرے میں۔

باپ: صاب جی! یہ جو شیرا ہے ناں میرا۔ میرے بغیر کہیں رہ نہیں سکتا۔

سینئر کلرک: تو کہنا کیا چاہتے ہو؟

باپ: یہ کمرے ——

سینئر کلرک: سمجھا —— مگر دیکھو —— مہربانی تو ہو جائے گی پر یہاں جو مریض رکھے جاتے ہیں انہیں بہت قیمتی دوائیں دی جاتی ہیں جو جرمنی، فرانس اور انگلینڈ سے منگوائی جاتی ہیں تا کہ مریض بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے۔ دواؤں کی قیمت تو دینی پڑے گی ہاں ٹکے مفت میں لگیں گے۔

باپ: دواؤں پر کتنے پیسے لگیں گے؟

(سینئر کلرک گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگتا ہے)

سینئر کلرک: کم از کم دو سو۔

باپ: اتنی ہمت نہیں۔

سینئر کلرک: تم سے بڑی رعایت کر دی جائے گی۔ سو دے دو! بس! یہ روپیہ سرکاری خزانے میں جمع ہو گا —— ہماری جیب میں ایک دمڑی بھی نہیں جا سکتی۔ سمجھ لیا؟

باپ: مجھ سے آدھے پیسے لے لیں ——— پتہ نہیں اور کہاں کہاں خرچ کرنا پڑے گا۔

سینئر کلرک: یہ تو بڑی مشکل بات ہے۔ سرکاری رقم میں زیادہ کمی نہیں ہو سکتی۔

(سپرنٹنڈنٹ آتا ہے۔ شلوار، قمیص اور اچکن پہنے ہوئے ہے۔ معمر آدمی)

سپرنٹنڈنٹ (سینئر کلرک سے): کیا بات ہے نور احمد؟

سینئر کلرک: آج وہ دو کمرے خالی ہوئے ہیں نا شاہ جی!

سپرنٹنڈنٹ: ہوئے تو ہیں۔

سینئر کلرک: ان کے لئے کہہ رہا ہے یہ۔

سپرنٹنڈنٹ (بڑی حیرت سے): مگر ان کا کرایہ تو دو سو سے کم ہو ہی نہیں سکتا۔

سینئر کلرک: مجھے رحم آگیا ہے اس پر۔ بڑے ڈاکٹر کی منت سماجت کر کے سو روپیہ تک کرا دوں گا۔

سپرنٹنڈنٹ: کیسے کرا دو گے؟ آدھی رقم کیسے معاف کر دیں گے۔

سینئر کلرک: کیا کیا جائے شاہ جی! اس بیچارے کے پاس کچھ ہے ہی نہیں۔ بڑا غریب آدمی ہے۔

باپ: جی میں بڑا ہی مسکین بندہ ہوں۔

سپرنٹنڈنٹ: کچھ بھی ——— اتنی رقم معاف نہیں ہو سکتی۔ لوگ تو پانچ پانچ سو دینے پر تیار ہو جاتے ہیں پھر بھی یہ کمرے نہیں دیئے جاتے۔

باپ: آپ کی بڑی مہربانی ——— ایک غریب کا گھر آباد ہو جائے گا۔

سپرنٹنڈنٹ : اچھا دیکھو تم گھر سے لائے کیا تھے؟

باپ : ڈیڑھ سو جی۔

سپرنٹنڈنٹ : چلو نور احمد! اس سے یہی رقم لے لو۔

باپ : اب ڈیڑھ سو نہیں رہے ـــ جی ـــ اب تو ایک سو اور پانچ ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ : تم یہ روپیہ کس لئے لائے تھے؟

باپ : ایک سیانے نے بتایا تھا کہ سرکاری ہسپتال میں روٹی کا خرچ دینا ہی پڑتا ہے ـــ میں چاہتا ہوں میرے شیرے کو بڑی اچھی خوراک ملے۔

سپرنٹنڈنٹ : انڈے، مکھن، پنیر، گھی، دودھ، پھل، پراٹھے، یہی چاہتے ہو نا؟

باپ (حیرت سے) : ہاں جی!

سپرنٹنڈنٹ : یہ چیزیں تمہارے بیٹے کو بالکل مفت ملا کریں گی۔

سینئر کلرک : صرف تمہارے بیٹے ہی کو نہیں تمہیں بھی ـــ اور پھر خدمت کرنے کے لئے دو نرسیں اور دو نوکر بھی ہوں گے۔ اب اور کیا چاہتے ہو؟

باپ : جی یہ چیزیں سچ مچ ملا کریں گی؟ ـــ جی سچ مچ ـــ میرا مطلب ہے ان کے پیسے تو نہیں دینے پڑیں گے؟ ہیں جی!

سینئر کلرک : تو کیا ہم جھوٹ بول رہے ہیں؟

باپ : صاب جی! ایک سو پانچ یہ ہیں (ڈب کھولتا ہے) اور بیس میں اپنے لئے لایا تھا اور تو میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں بچی۔!

سینئر کلرک (سپرنٹنڈنٹ سے) : شاہ جی! بڑے ڈاکٹر کی زیادہ منتیں کر لیں گے۔

سپرنٹنڈنٹ : بات مشکل نظر آتی ہے ——— اچھا!

باپ (سارے روپے سپرنٹنڈنٹ کو دیتے ہوئے) : اللہ آپ کو ہسپتال کا مالک بنائے۔

(سینئر کلرک اور سپرنٹنڈنٹ دونوں مسکراتے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نوٹ جیب میں رکھ لیتا ہے)

سپرنٹنڈنٹ : ہم دونوں بڑے ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں تمہیں مل جائیں گے۔

(دونوں کمرے سے نکل جاتے ہیں ——— باپ دونوں کے ساتھ دروازے تک جاتا ہے۔ پھر واپس آتا ہے۔ بڑا خوش نظر آرہا ہے۔ آتے ہی بیٹے سے لپٹ جاتا ہے)

باپ : اب تو بیڑا پار ہو گیا ہے شیرے! دو کمرے ملیں گے اور کھانے کو انڈے، دودھ، پھل۔ میرا شیرا پہلوان ہو کر نکلے گا۔ کیوں شیرے! ——— تمہیں کمرے میں چھوڑ کر اپنے چودھری فضلو کے پاس جاؤں گا۔ اس سے کرایہ لے کر تیری ماں کے پاس پہنچ جاؤں گا اور اسے خبر سنا کر تمہارے پاس آجاؤں گا۔

بیٹا : ہُنہ ہُنہ۔

باپ : اللہ نے بڑا ہی فضل کر دیا ہے۔ تیری پگلی ماں تو یوں ہی گھبرا رہی تھی۔ اب اسے جا کے بتاؤں گا کہ تیرا اپریشن ہو رہا ہے تو وہ حیران رہ جائے گی۔

بیٹا : اماں!

باپ : اب تو اپنی اماں کے پاس جائے گا تو دوسرے لڑکوں کی طرح ہو گا۔ سمجھ دار

اور چنگا بھلا۔ تیری ماں تو تجھے دیکھ کر خوشی سے پھول ہی جائے گی۔

(ایک ڈاکٹر آتا ہے۔ اعلےٰ درجے کے سوٹ میں ملبوس)

ڈاکٹر (بیٹے کو دیکھتے ہوئے) : تو یہ لڑکا ہے۔

باپ : جی —— جی ڈاکٹر صاب جی!

ڈاکٹر : بولنا چالنا نہیں ہے؟

باپ : بس نہ نہ نہ کہتا ہے اور اماں کہتا ہے۔

ڈاکٹر : مار کٹائی تو نہیں کرتا؟

باپ : جی نہیں۔

ڈاکٹر (بیٹے سے) : کیوں علی! کیا بات ہے؟

باپ : اس کا نام شیرا ہے جی!

ڈاکٹر : شیرا —— شیخ صاحب نے تو اپنے خط میں اس کا نام علی بتایا ہے —— (جیب سے

خط نکال کر اس پر نگاہ ڈالتا ہے) ہاں علی ہی تو ہے اس کا نام۔

باپ : نہیں جی شیرا ہے —— اس کی ماں کہتی تھی میرا پتر بڑا زور والا ہوگا۔ شیر

کی طرح۔ اسی نے نام رکھا تھا۔

ڈاکٹر : تمہیں شیخ اصغر علی نے بھیجا ہے نا؟

باپ : ہم تو دیپال پور سے آئے ہیں —— ہمیں باؤ سعید نے کہا تھا اسے

پاگل خانے لے جاؤ۔

ڈاکٹر: بیپال پور سے ---- (گھور کر باپ کو دیکھتا ہے) ہوں۔

باپ: ڈاکٹر صاب جی! ہم کمروں میں کب جائیں گے؟

ڈاکٹر: ہسپتال میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

(ڈاکٹر تیزی سے چلا جاتا ہے۔ باپ حیران وہیں کھڑا رہ جاتا ہے)

باپ: پتہ نہیں کون تھا؟

(بیٹا دروازے کی طرف جانے لگتا ہے)

شیرے پتر! کہاں چلے؟

(بیٹا چلا جا رہا ہے۔ باپ بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

کیوں پتر! کیا ہوا؟ ابھی ہم اپنے کمروں میں چلے جائیں گے۔ (بیٹے کو صوفے کی طرف لے جاتا ہے)

بیٹا: اماں!

باپ: بس ابھی جاتے ہیں۔

(چپڑاسی آتا ہے)

لو آ گیا ---- (چپڑاسی سے) چلو یار بڑا تنگ کر رہا ہے۔

(باپ بیٹے کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے اور دروازے کی طرف جاتا ہے)

(چپڑاسی وہیں کھڑا رہتا ہے)

چپڑاسی: کدھر چلے چودھری؟

باپ : اپنے کمروں میں جائیں گے ناں ——— میں اسے چھوڑ کر اس کی ماں کو خبر
سنانے جاؤں گا۔ ذرا اس کا خیال رکھنا ——— تمہاری خدمت کر دیں گے یار۔

چپڑاسی : چودھری! معاملہ کچھ خراب ہو گیا ہے۔

باپ : کیا؟

چپڑاسی : معمولی بات ہے۔ ہوا یہ کہ جب ہمارے صاحب تمہاری درخواست لے کے
بڑے ڈاکٹر کے کمرے میں گئے تو ڈاکٹر باہر جا رہے تھے۔ تمہاری درخواست پر
ان کے دستخط نہیں ہوئے۔

باپ : تو پھر کیا! ہو جائیں گے۔

چپڑاسی : قانون یہ ہے کہ جب تک بڑے ڈاکٹر کے درخواست پر دستخط نہ ہوں کسی
بیمار کو یہاں داخل نہیں کیا جا سکتا ——— یہ آڈر ہے گورنمنٹ کا۔

باپ : ڈاکٹر صاحب کب تک آ جائیں گے؟

چپڑاسی : کوئی پتہ نہیں۔ کبھی ایک ہفتہ باہر رہتے ہیں اور کبھی پندرہ دن۔

باپ : پندرہ دن؟

چپڑاسی : جلدی بھی آ جاتے ہیں۔ گھبرا کیوں گئے ہو۔ یہاں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔

باپ : ہوتا رہے مجھے کیا۔ مجھے تو وہ کہہ کر گئے ہیں کہ تم دونوں کو ابھی کمرے مل
جائیں گے۔

چپڑاسی : کون کہہ کر گئے ہیں؟

باپ: کالے کوٹ والے۔

چپڑاسی: وہ ہمارے سپرٹن ڈنٹ ہیں۔

باپ: وہ ابھی آئیں گے اور ہمیں کمروں میں چھوڑ آئیں گے۔

چپڑاسی: ابھی شاہ صاحب نے کہا ہے کہ تم واپس اپنے گھر چلے جاؤ۔ بڑے ڈاکٹر آئیں گے تو تمہیں خط لکھ کر بلا لیا جائے گا۔

باپ: کیا؟

چپڑاسی: گھر چلے جاؤ۔

باپ: دیکھ لینا ابھی ہم اپنے کمروں میں چلے جائیں گے۔

چپڑاسی: ضرور جاؤ گے پر آج نہیں۔

باپ: ہم تو آج ہی جائیں گے۔

(جونیئر کلرک آتا ہے)

جونیئر کلرک (باپ سے): کیا بات ہے چودھری؟

باپ: جی او دیکھو (چپڑاسی کی طرف اشارہ کر کے) یہ کہتا ہے تم گھر چلے جاؤ۔

جونیئر کلرک: بات یہ ہے چودھری! ہمارے بڑے ڈاکٹر صاحب ایک بے حد ضروری کام پر باہر چلے گئے ہیں۔ یہ تو کوئی بات نہیں۔ آجائیں گے تو کام ہو جائے گا چند روز ہی کا تو معاملہ ہے۔

باپ: میں تو بڑی مشکل سے شیرے کو لایا ہوں حضور! ہمیں تو آج ہی داخل کر لیں۔

اللہ آپ کا بھلا کرے۔

جونیئر کلرک: یہ تو بڑا اچھا بچہ ہے۔ تمہارے ساتھ چلا جائے گا اور پھر تمہارے ساتھ واپس بھی آجائے گا۔

باپ: نہ جی!

جونیئر کلرک: یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے، چودھری! جب تک بڑے ڈاکٹر صاحب کی منظوری نہ مل جائے ہم کسی کو عام کمرے میں بھی نہیں لے جا سکتے۔ پاگل خانے کے قانون بڑے سخت ہیں۔

باپ: وہ داخل کرلیں گے۔

جونیئر کلرک: وہ — کون وہ؟

چپڑاسی: شاہ صاحب کو کہتا ہے۔

جونیئر کلرک (چپڑاسی سے): تو انہیں بلا لاؤ۔ خود آ کر کہہ دیں گے۔

(چپڑاسی چلا جاتا ہے)

چودھری! یہ شاہ صاحب کی بڑی مہربانی ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اتنی رعایت کر رہے ہیں۔ یہاں تو بھائی لوگ چھ چھ ماہ چکر لگاتے ہیں۔ ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں جب کہیں جا کر کسی کو داخل کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کا کہا مان کر چپ چاپ چلے جانا۔ ضد نہ کرنا۔ خواہ مخواہ ناراض ہو جائیں گے۔

(سپرنٹنڈنٹ آتا ہے)

باپ (بھاگ کر اس کے پاس پہنچتے ہوئے): صاحب جی! یہ کیا کہہ رہے ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ: کیا کہوں چودھری! وہ اپنے ڈاکٹر صاحب دستخط کرنے سے پہلے ہی چلے گئے اور اب آئیں گے کہیں دس پندرہ دن کے بعد۔ میں نے تمہاری درخواست لکھ لی ہے۔ بس دستخط کرانے کی دیر ہے۔ تم اپنا پتہ لکھوا کر چلے جاؤ۔

(باپ دو تین لمحے چپ چاپ سپرنٹنڈنٹ کو دیکھتا رہتا ہے)

باپ: صاحب جی! میں شیرے کو ایسے ہی گھر لے گیا تو اس کی ماں کا بہت بُرا حال ہو جائے گا۔ سات آٹھ مہینے سے کھانسی والے بخار سے مر رہی ہے۔ اس نے روپیہ اپنی بماری پر خرچ نہیں کیا مجھے دے دیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: تم سمجھے نہیں ہو بات۔ تمہارا بیٹا ضرور داخل کر لیا جائے گا مگر چند روز یا چند ہفتے بعد، جب بڑے ڈاکٹر صاحب واپس آجائیں گے۔

باپ: تو میں شیرے کو واپس کیسے لے جاؤں؟

سپرنٹنڈنٹ: جس طرح لے کر آئے تھے۔

جونیئر کلرک: اپنا پتہ لکھاؤ (ایک جیب سے فونٹن پن اور دوسری سے کاغذ نکالتا ہے) کیا پتہ ہے؟

باپ: اچھا یوں کر لو۔ میں داخل نہیں ہوں گا۔ گھوم پھر کر دن گذار لیا کروں گا۔ شیرے کا علاج کر دو۔

سپرنٹنڈنٹ: فضول وقت ضائع کر رہے ہو۔ ایک مرتبہ کہہ دیا ہے چلے جاؤ۔

چونٹر کلرک : بس چلے جاؤ - اسی میں تمہاری بہتری ہے - ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس میں تمہارا ہی بھلا ہے - لو اب وقت نہ گنواؤ چلے جاؤ -

باپ : چلا جاؤں ؟

سپرنٹنڈنٹ : ہاں !

باپ : میں نے سارا مال دے دیا ہے -

سپرنٹنڈنٹ (غصے سے) : کیا مال دے دیا ہے - یہاں لوگ ہزاروں خرچ کر دیتے ہیں اور پھر بھی ان کو داخل نہیں کیا جاتا -

باپ : صاب جی ! آپ نے تو مجھ پر بڑا رحم کیا تھا -

سپرنٹنڈنٹ : ایک مرتبہ کہہ دیا ہے جاؤ ---- بس چلے جاؤ خط ملے تو آجانا -

(چھوٹا ڈاکٹر آتا ہے)

چھوٹا ڈاکٹر (سپرنٹنڈنٹ سے) : شاہ جی ! شیخ صاحب کی سفارش آئی تھی ایک لڑکے کے متعلق - علی اس کا نام ہے - کوئی آدمی اسے لے کر آئے گا تو ----

سپرنٹنڈنٹ : بہت بہتر جناب -

باپ (چھوٹے ڈاکٹر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر) : ڈاکٹر جی ! مجھ پر رحم کرو - میرے بچے کو داخل کر لو -

چھوٹا ڈاکٹر (سپرنٹنڈنٹ سے) : شاہ جی ! جگہ ہے تو داخل کر لو -

باپ : ڈاکٹر جی ! بڑے ڈاکٹر جی باہر چلے گئے ہیں - آپ منظوری دے دیں -

چھوٹا ڈاکٹر: بڑے ڈاکٹر یہیں ہیں۔ باہر کہاں گئے ہیں ـــــ (سپرنٹنڈنٹ سے) تو شاہ جی! اس کیس کا خاص خیال رکھنا۔ علی نام ہے لڑکے کا۔

سپرنٹنڈنٹ: اچھا جناب!

(چھوٹا ڈاکٹر چلا جاتا ہے)

باپ: بڑا ڈاکٹر یہاں ہے۔ تم کہتے تھے بڑا ڈاکٹر باہر چلا گیا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ: (باپ کو غضب ناک نظروں سے دیکھ کر): جاؤ اب تمہارا بیٹا داخل نہیں ہوگا۔

باپ: کیوں؟

سپرنٹنڈنٹ: نہیں ہوگا ـــــ ضد کرتے ہو۔ تمہاری یہی سزا ہے کہ آئندہ تمہیں یہاں آنے کی اجازت ہی نہ دی جائے۔

باپ: ایسا نہ کہو صاب جی! آپ نے میرے سارے پیسے لے لئے ہیں اور اب ـــــ

سپرنٹنڈنٹ: پیسے ـــــ کون سے پیسے ـــــ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ چپڑاسی! دیکھو اگر یہ نہ جائے تو اسے دھکا دے کر نکال دو۔

چپڑاسی: اچھا جی!

باپ: کون سے پیسے ـــــ میں نے تیس کم دو سو روپیہ نہیں دیا ـــــ تم سب نے میرا روپیہ لیا ہے ـــــ اب کہتے ہو کون سے پیسے؟

(باپ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سپرنٹنڈنٹ کو دیکھ رہا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ، چپڑاسی اور جونئر کلرک چلے جاتے ہیں۔ باپ انہیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا ہے۔ بیٹا باپ کے پاس آتا ہے)

بیٹا: اماں!

باپ (غصے میں بیٹے کو زور سے ہاتھ مارتے ہوئے): ٹھہر او ٹے سور دے پتر!

(بیٹا منہ کے بل گر پڑتا ہے۔ اٹھتا ہے۔ باپ کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہوا

پیچھے چلا جاتا ہے۔ اس کی پیشانی زخمی ہو گئی ہے۔ باپ اس طرف جانے لگتا ہے)

بیٹا (پیچھے ہٹتے ہوئے): نہ نہ نہ۔

(چپڑاسی دروازے پر آتا ہے)

چپڑاسی: چلو چودھری!

(باپ مڑ کر اس کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر ایک قدم آگے بڑھاتا ہے)

جانتے ہو یا دھکے مار مار کر نکالوں۔

(باپ تیزی سے اس کی طرف آتا ہے اور زور سے اس کا گریبان پکڑ لیتا ہے)

باپ: نکالو دھکے مار مار کر۔ نکالو کس طرح نکالتے ہو۔ نکالو۔

(چپڑاسی "شاہ جی مار ڈالا، شاہ جی مار ڈالا" چلا چلا کر کہتا ہے۔ سپرنٹنڈنٹ

اور دو دوسرے کلرک آتے ہیں)

سپرنٹنڈنٹ (باپ کا ہاتھ چپڑاسی کے گریبان سے الگ کرتے ہوئے): چھوڑ بدمعاش!

باپ: میرا سارا روپیہ دو ——— میرا روپیہ دو ———

سپرنٹنڈنٹ: دیں تمہیں روپیہ ——— یہ لو ———

(سپرنٹنڈنٹ باپ کے منہ پر دھپڑ مارتا ہے۔ بیٹا باپ کے پاس آ کر کہتا ہے نہ نہ نہ۔

اس کی پیشانی سے خون بہ رہا ہے۔ باپ کی نظر اس کی پیشانی پر پڑتی ہے اور اس کی

گرفت زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔

سپرنٹنڈنٹ (ڈپٹی سے) ''پاجی پیچھے ہٹ'' کہہ کر اسے ہٹا رہا ہے۔ اب دونوں کلرک بھی باپ کو ہٹاتے ہیں۔ چپڑاسی کا گریبان پھٹ گیا ہے۔ کلرک باپ کو ایک طرف گرا دیتے ہیں۔

(بڑا ڈاکٹر آتا ہے۔ شاندار سوٹ پہنے ہوئے۔ آنکھوں پر عینک)

بڑا ڈاکٹر: یہ شور کیا ہے۔ کیا بدتمیزی ہو رہی ہے۔ نان سنس۔

(سپرنٹنڈنٹ، کلرک اور چپڑاسی ایک طرف ہٹ جاتے ہیں)

سینئر کلرک (باپ کی طرف اشارہ کر کے)**:** پتہ نہیں سرکار! اس شخص کو کیا ہو گیا ہے کہتا ہے میرے بیٹے کو ابھی داخل کرو ورنہ میں نہیں جاتا۔

سپرنٹنڈنٹ: چپڑاسی کا گریبان پھاڑ دیا ہے۔ ہم نہ آتے تو اس غریب کو مار ہی ڈالتا۔

باپ (بڑے ڈاکٹر سے)**:** صاحب جی! اللہ واسطے میری فریاد سن لو۔ یہ کہتے تھے تم دونوں کو داخل کر لیں گے۔ مجھ سے سارا روپیہ لے لیا ہے اور اب کہتے ہیں بڑا ڈاکٹر یہاں نہیں ہے۔

بڑا ڈاکٹر: روپیہ لے لیا ہے؟ کیا مطلب؟

باپ: میرا سارا روپیہ جی —— تیس کم دو سو روپیہ۔

بڑا ڈاکٹر (سپرنٹنڈنٹ سے)**:** یہ کیا گڑبڑ ہے! کیا ہو رہا ہے!!

سپرنٹنڈنٹ: کچھ نہیں حضور! یہ شخص جھوٹ بولتا ہے۔

باپ: ہیں (بیٹے کی طرف اشارہ کرکے) اپنی اولاد کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ انہوں نے
مجھ سے سارا روپیہ لے لیا ہے۔

بڑا ڈاکٹر: ہوں! اچھا (سپرنٹنڈنٹ سے) جاؤ تم لوگ۔

(سپرنٹنڈنٹ، دونوں کلرک اور چپڑاسی چلے جاتے ہیں)

باپ (آنکھوں میں امید کی چمک): ڈاکٹر جی! آپ نہ آتے تو میرا بیڑا غرق ہو جاتا۔
کہتے تھے بڑا ڈاکٹر باہر چلا گیا ہے۔

بڑا ڈاکٹر: غصہ کیا ہے؟ (شیرے کی طرف دیکھ کر) اسے داخل کرانا چاہتے ہو اور
اس کے ماتھے سے تو خون بہہ رہا ہے، صاف کرو۔

(باپ کرتے سے بیٹے کا ماتھا صاف کرنے لگتا ہے)

بیٹا: نہ نہ نہ۔

بڑا ڈاکٹر: تو تم اس کا علاج کروانا چاہتے ہو۔

(باپ اثبات میں سر ہلاتا ہے)

باپ: ہاں جناب!

بڑا ڈاکٹر: علاج ہو جائے گا۔

باپ: ڈاکٹر جی! وہ کہتے تھے ——

بڑا ڈاکٹر: ان کا ذکر چھوڑو۔ نپٹ لوں گا ان سے۔ کب داخل کروانا چاہتے ہو؟

باپ: آج ہی داخل کرلیں۔